ترجمانِ اسرار

اسرارِ خودی کا منظوم اردو ترجمہ

آنریبل مسٹر جسٹس شیخ عبدالرحمٰن

مکتبۂ کارواں، ایبک روڈ، انارکلی، لاہور

ترجمانِ اسرار

از پروفیسر جسٹس شیخ عبدالرحمٰن

مکتبۂ کاروان، ایبک روڈ، انارکلی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

مطبع : کارواں پریس ، ایبک روڈ ، انارکلی ، لاہور
طابع و ناشر : چودھری عبدالحمید ایم ۔ اے۔

قیمت : تین روپے

سرآغاز

غالباً سنہ ۱۹۴۳ء کا آغاز تھا کہ میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں آن دنوں سرگودھا میں متعین تھا جہاں کا ماحول ادبی اور علمی نہیں کہلا سکتا تھا۔ لیکن دیکھتا کیا ہوں کہ علامہ اقبال اپنے بے تکلفانہ انداز سے مجلس جمائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں۔ نشست فرشی ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ میں پہنچا تو کسی نے میرا نام لیکر کہا: لیجئے یہ بھی آ گئے۔ حکیم الامت نے مجھ سے مصافحہ کیا اور پاس بٹھا لیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اسے اشارۂ غیبی کہئے یا حسن اتفاق، لیکن یہ حقیقت ہے کہ چند دن بعد مجھے مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر 'نوائے وقت' کا خط موصول ہؤا جسمیں انہوں نے 'اسرار خودی' کے بعض حصوں کو اردو نظم میں منتقل کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کام کا بیڑا اٹھاؤں۔ میں نے انہیں لکھا کہ اس اہم کام کے لئے کسی قادرالکلام شاعر کی خدمات حاصل کیجائیں تو بہتر ہوگا کیونکہ نہ تو مجھے کبھی شاعری کا دعویٰ ہؤا ہے اور نہ اپنی زباندانی پر اسقدر اعتماد ہے کہ ایک فلسفی شاعر کے کلام کے ترجمہ کی مہم کما حقہ سر کر سکوں۔ لیکن نظامی صاحب

کی طرف سے پیہم اصرار ہؤا کہ یہ کام ملی نقطۂ نظر سے مفید ہو گا اور شاعر حضرات اس طرف توجہ نہیں کر رہے ۔ آخر کار تجویز یہ ٹھیری کہ میں ایک باب کا ترجمہ کر دوں جو نوائے وقت میں (جو آن دنوں ہفتہ وار چھپتا تھا) شائع کیا جائے اور اگر علم دوست حضرات کی آراء ترجمہ کے حق میں آئیں تو سلسلہ جاری رکھا جائے ۔ چند رائیں جو پہلی قسط ترجمہ سے متعلق ظاہر کی گئیں، حوصلہ افزا تھیں ۔ اسلئے ایک مصروف زندگی کے لمحات فرصت ترجمہ کے لئے وقف ہو گئے ۔ اور ترجمہ بالاقساط نوائے وقت ہفتہ وار میں شائع ہوتا رہا ۔ ۱۹۴۷ میں اسکی تکمیل ہو گئی ۔

اب دوستوں کا اصرار ہؤا کہ ترجمہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے ۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم ان احباب میں پیش پیش تھے ۔ مجھے احساس تھا کہ ترجمہ نظر ثانی کا محتاج ہے ۔ لیکن فرصت نایاب تھی ۔ اس مشکل کا حل تاثیر مرحوم نے یہ پیش کیا کہ میں انہیں ترجمہ کے ٹکڑے نقل کراکے وقتاً فوقتاً بھجواتا جاؤں اور وہ جہاں جہاں کھٹکیں، نشان کرتے جائیں ۔ نیز اگر کوئی ترمیم انہیں سوجھ جائے تو حاشیہ میں لکھ دیں ۔ لیکن اسے قبول یا رد کرنے کا مجھے اختیار ہو گا ۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل شروع ہو گیا ۔ اور آخر نظر ثانی کی مہم طے ہوئی ۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے جو مشورے پیش کئے ان میں سے اکثر ــ بعض اوقات بادنیٰ تصرف ــ میں نے قبول کر لئے ۔ لیکن پھر بھی متن کی صحت کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر کچھ خامیاں ترجمہ میں رہ گئی ہوں تو قارئین انہیں میری نارسائی پر محمول کریں ۔ میں اب بھی ترجمہ سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہوں ۔

بہر حال جو کچھ میں کر سکا پیش خدمت ہے۔ اس ترجمہ کا مقصد فن شاعری کا مظاہرہ نہیں ہے۔ اسلئے امید ہے کہ اسکی فنی اور لسانی کوتاہیوں کو اہل زبان اور زبان دان حضرات کی وسیع النظری کے دامن میں پناہ مُل سکیگی۔ ترجمہ کی دقتوں کا وہی اصحاب اندازہ لگا سکتے ہیں جنہوں نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہو۔ میں نے شعر بہ شعر ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں میں نے ڈاکٹر نکلسن کے انگریزی ترجمہ سے اختلاف کیا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن نے اس ترجمہ کے ذریعے اقبالیات کی نہایت گراں قدر خدمت سر انجام دی تھی۔ انہوں نے ہی پہلے پہل کلام اقبال سے مغربی دنیائے ادب کو روشناس کرایا۔ لیکن بعض اشعار کا صحیح مفہوم سمجھنے سے میری ناقص رائے میں وہ قاصر رہے۔ تاہم آن کی بیش بہا خدمات کا اعتراف نہ کرنا ایک اخلاقی اور ادبی گناہ ہوگا۔

اصل کتاب کی اہمیت سے کسی صاحب فکر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ خودی کا فلسفہ علامہ اقبال کے نظام فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کا سیاسی تصور پیش کرنے سے بہت پہلے حکیم‌الامت نے ایک ادبی پاکستان کی بنیاد رکھدی تھی اور اس شاندار قصر فکر کے لئے جو آن کی خداداد ذہانت اور بصیرت نے ملت اسلامیہ کے حضور میں پیش کیا، اسرار خودی گویا کونے کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ فلسفۂ خودی کے پہلوؤں پر حاوی ایک مبسوط مقدمہ اس ترجمہ کے لئے لکھتا کیونکہ میری نظر میں اسرار خودی ایک انقلاب آفرین کتاب ہے۔ لیکن اتنی فراغت نصیب نہ ہوسکی

که اطمینان سے بیٹھ کر اس اہم موضوع پر قلم اٹھاتا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم آجکل لاہور میں مقیم ہیں۔ انہوں نے میری درخواست پر اس ترجمہ کے لئے ایک گراں قدر مقدمہ لکھدیا ہے۔ خلیفہ صاحب خود حکیم بھی ہیں اور شاعر اور ادیب بھی۔ حکیم الامت کے افکار پر تبصرہ کرنے کے لئے اُن سے بہتر شخصیت غالباً پاکستان بھر میں موجود نہیں۔ میں ان کا بغایت ممنون ہوں کہ اپنی اہم مصروفیات کے باوجود انہوں نے وقت نکال کر ایک سیر حاصل مقدمہ اس کتاب کے لئے مرحمت فرمایا۔

اس کتاب کی حاشیہ آرائی اور اس کے صوری محاسن ہمارے ملک کے مشہور آرٹسٹ عبدالرحمان چغتائی کے مو قلم کے مرہون منت ہیں۔ میں اُن کا سپاس گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی فنکارانہ طباعت میں عملی دلچسپی لی اور نہایت وقیع مشورے دئے۔ مکتبۂ کارواں کے نوجوان مالک مسٹر عبدالحمید کی خوش ذوقی اور علم دوستی اس کتاب کی دیدہ زیب طباعت کا باعث بنی۔ انہوں نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کرایا ہے۔ یہ اُن کے خدمت علم و ادب کے بے لوث جذبہ پر دال ہے۔

ترجمہ چودھری محمد حسین صاحب مرحوم کی اجازت سے کیا گیا تھا اور جس شرط کے ساتھ ترجمہ کی کتابی صورت میں اشاعت مشروط کی گئی تھی، اُس کے ایفا کو میں اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔

لاہور
جنوری، ۱۹۵۲ء

ایس اے رحمٰن

مقدّمہ

از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب، ایم ۔ اے، پی ایچ ۔ ڈی،
سابق صدر شعبۂ فلسفہ، جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن

انسان کی نظر باطن سے پہلے خارج پر پڑتی ہے ۔ آنکھ خارج کی ہر شے کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی ۔ کہتے ہیں کہ عرفان کی تین قسمیں یا تین پہلو ہیں ۔ دنیا شناسی، خدا شناسی اور خود شناسی ! اقبال نے بھی جب انسان کی بے بضاعتی کے متعلق خدا سے شکایت کی تو یہی کہا کہ کیا یہی تیرے ہنر کا شہ کار ہے جو نہ خود بیں ہے، نہ خدا بیں ہے ، اور نہ جہاں بیں ؟ انسان مادی اور حیوانی حیثیت میں اپنے ماحول سے دست و گریباں ہوتا ہے ۔ گرد و پیش کی اشیا اور حوادث کی ماہیت کو سمجھنا اس کے لئے تنازع للبقا میں ناگزیر ہوتا ہے ۔ خارجی مطابقت اور مخالفت سے فرصت ملے تو سوچے کہ خود میری ماہیت کیا ہے ؟ یا میں اور میرا ماحول، میری موافق اور مخالف قوتیں، کہاں سے سرزد ہوتی ہیں ؟ زندگی میں ہر جگہ پیکار اضداد نظر آتی ہے ۔ کیا یہ کشاکش ازلی متخاصم قوتوں کی مسلسل جنگ ہے یا یہ اضداد کسی ایک اصل وحدت کے متضاد نما پہلو ہیں ؟ انسان کے پاس خارج کو سمجھنے کے لئے بھی خود اپنے ہی نفع و ضرر اور اپنی ہی جبلتوں

کے سانچے ھیں اس نے فطرت کی قوتوں کو اپنے اوپر قیاس کیا اور اپنی خواھشوں کے دیوتا بنا لئے ۔ وہ خود اپنے تصورات کو مشخص کر کے ان کو لا متناھی قوتوں کا حامل بنا کر ان سے مرعوب ھو گیا ۔ ان کو راضی رکھنے کے لئے اپنی عزیز ترین چیزوں اور خود اپنے آپ کو ان پر بھینٹ چڑھانا شروع کیا ۔ اپنی حقیقی خودی سے نا آشنا ھونے کی وجہ سے وہ ھستی جس کو تسخیر فطرت کی صلاحیت ودیعت کی گئی تھی، خود فطرت کی قوتوں سے مسخر اور مغلوب ھو گئی ۔ ابھی انسان اپنی حقیقی خودی سے آشنا نہ ھؤا تھا ۔ وہ اپنے آپ کو فقط حیوانی جبلتوں کا حامل سمجھا ۔ اس لئے اس نے جو دیوتا تراشے وہ بھی انہی متلون اور عارضی خواھشوں کے مجسمے تھے ۔ وہ خارج میں جن دیوتاؤں کی پرستش کرتا رھا وہ اس کی اپنی خودی کے بگڑے ھوئے تصورات تھے ۔ ان دیوتاؤں کے بت زبان حال سے پجاری کو کہ رھے تھے :

مرا بر صورت خویش آفریدی بروں از خویشتن آخر چہ دیدی ؟

اس تصور حیات اور اس انداز پرستش سے انسان کو نہ وجود مطلق کی ماھیت تک کچھ رسائی ھوئی اور نہ وہ اپنی ذات کا کوئی صحیح اندازہ لگا سکا ۔

تکثیر یا کثرت اصنام کا راستہ چھوڑ کر انسان نفس وحدت کا جویا ھؤا ۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ھو چکا ھے اس کا ابتدائی تصور وجود خارجی کائنات ھی کا تصور تھا اس لئے اس نے اس خارج ھی کی کثرت اور گونا گونی کو کسی ایک وحدت میں منسلک کرنے کی کوشش کی ۔ یونانیوں کے پہلے مفکر

طالیس ملطی نے کہا کہ وجود مطلق فقط پانی ہے ۔ پانی ہی ہر وجود کا جوہر ہے ۔ تمام ٹھوس چیزیں بھی پانی ہی کی مختلف شکلیں ہیں ۔ اس نے زندہ اور غیر زندہ میں، یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات میں کوئی بنیادی فرق نہ سمجھا ۔ زندگی کے تمام کوائف اور نفس کی تمام حالتیں بھی پانی ہی میں بالقوی اور بالفعل پائی جاتی ہیں ۔ اس نظریۂ وجود کو تاریخ فلسفہ میں ہائی لوزو ازم (Hylozoism) کہتے ہیں جس میں مادیت، نفسیت اور حیاتیت ابھی ایک دوسرے سے متمیز نہیں ہیں ۔ اس نظریہ کے مطابق نہ کائنات میں کوئی نفس یا خودی ہو سکتی ہے اور نہ انسان کے اندر ۔ زندگانی ہر جگہ آنی جانی اور پانی ہی پانی ہے ۔ اور چیزوں کی طرح آدمی بھی پانی ہی کا بلبلا رہ گیا ۔ انسانی اقدار، انسانی جذبات اور تمنائیں کوئی مستقل حقیقت نہیں رکھتیں ۔ بقول سنائی نجفی :

دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یونانی مفکرین، ارتقائے فکر میں رفتہ رفتہ تجسم سے تصور کی طرف، جسم سے نفس کی طرف یا خارج سے باطن کی طرف آتے گئے ۔ انہوں نے کثیف مظاہر میں لطیف حقائق کا کھوج لگانا شروع کیا ۔ فیثا غورس نے دیکھا کہ خارجی عالم میں ہر جگہ تناسب، توازن اور اندازہ پایا جاتا ہے ۔ ریاضی کے اصول ہر جگہ غیر متبدل طور پر کارفرما ہیں ۔ خاک کے اعمال ہوں یا افلاک کے حرکات، سب کے سب ریاضی کے اٹل اصولوں کے مطابق ہیں ۔ دو اور دو چار چیزیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں ۔

لیکن مجرد طور پر دو اور دو کے اعداد ملکر چار ھی رھتے ھیں ۔ ھر چیز کی تعمیر کی اصل یہی ھے کہ اس میں ریاضی صورت پذیر ھو گئی ھے ۔ ریاضی میں نہ کسی کی خواھش کو دخل ھے اور نہ ارادے کو ۔ ریاضی ھی وہ حقیقت ھے جسے 'الان کما کان' کہہ سکتے ھیں ۔ ریاضی کے اصول اصلاً اور ازلاً ساکن ھیں ۔ اشیا اور حوادث میں کون و فساد یا حرکت ھو سکتی ھے، لیکن اصول میں کوئی حرکت نہیں ھو سکتی ۔ علت و معلول کا سلسلہ حرکیاتی سلسلہ نہیں بلکہ قضایائے اقلیدس کی طرح کا سلسلہ ھے ۔

یونانی فلسفہ ترقی کرتا ھؤا سقراط ، افلاطون اور ارسطو کے مقولات تک جا پہنچا ۔ پہلے تغیر اور ثبات کے نظریات میں کشمکش ھوتی رھی ۔ کسی نے کہا کہ وجود مطلق بے تغیر و بے حرکت ھونا چاھئے ۔ لہذا تغیر یا حرکت ادراک کا دھوکا ھیں ۔ یونانیوں پر یہ تصور زیادہ تر غالب رھا کہ حقیقت غیر متغیر ھونی چاھئے ۔ جہاں تبدل اور تغیر ھے وھاں وجود محض اعتباری یا مجازی ھے اور اصلیت سے دور ھے ۔ جو مفکر نفسیت یا روحیت کی طرف گئے ـــــ جیسے فیثا غورس یا افلاطون ـــــ وہ بھی وجود مطلق میں حرکت کے قائل نہیں تھے اور جو دیمقراطیس کی طرح مادیت کی طرف آئے، ان کو بھی اس خیال سے چھٹکارا حاصل نہ ھؤا کہ کائنات کے حوادث ، مادے کے اجزائے لایتجزے یعنی ایٹموں کے جوڑ توڑ کا کھیل ھیں ۔ ایٹم چونکہ تحلیل نہیں ھو سکتا اس لئے اس میں کوئی تغیر نہیں ھوتا ۔ البتہ ایٹموں کی ترکیب یا قرب و بعد سے چیزیں بنتی اور بگڑتی رھتی

ھیں ۔ اس کون و فساد کے قوانین لا شعوری ھیں ۔ ان میں اقدار پروری یا مقصد کوشی کا کوئی سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ۔ سقراط ، افلاطون اور ارسطو مادے سے نفس کی طرف آئے ۔ نفس نے خارج کی طرف سے منہ پھیر کر باطن کا رخ کیا تو ان کو نفس عقل منطقی کا کرشمہ دکھائی دیا ۔ خارج کی کائنات بھی عقل سے وجود میں آتی اور اس کی بدولت قائم رھتی ھے ۔ باطن کی نفسی کائنات بھی عقل کی بدولت وجود مطلق کا عرفان حاصل کرتی اور افکار و جذبات کی کثرت کو ایک وحدت میں پروتی ھے ۔ لیکن عقل بھی کوئی انفرادی چیز نہیں ۔ عقل کلیت کی مرادف ھے ۔ عقل کا عالم کلیات کا عالم ھے ۔ اس میں خودی یا شخصیت یا ارادے کا کوئی سوال نہیں ۔ عقل کے تمام کلیات از روئے منطق ایک دوسرے سے منسلک اور مربوط ھیں ۔ اشیا اور حوادث کی متغیر کثرت غیر متغیر تصورات سے بہرہ اندوز ھونے کی ناکام اور مضطرب کیفیت ھے ۔ خدا عاقل نہیں بلکہ خود عقل کل ھے ۔ وہ خود ھی اپنے شعور کا معروض ھے ۔ اس کو اپنے سوا کسی کا علم نہیں ھو سکتا ۔ ماسوا کا حقیقی وجود ھی نہیں اس لئے اس کے علم کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ۔ انسانی نفوس میں جو خواھشوں اور ارادوں کا عنصر ھے وہ تغیر کے عالم سے تعلق رکھتا ھے ۔ لہذا بے حقیقت ھے ۔ انفرادی نفس میں حقیقت اتنی ھی ھے جس حد تک کہ وہ عقل کل سے بہرہ اندوز ھے ۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت یا مخصوص تقدیر نہیں ۔

اس نظریہ سے افلاطون اور ارسطو دونو نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عقل یا علم اصلی چیز ھے اور عمل اس کے مقابلے میں

ثانوی حیثیت رکھتا ھے ۔ بہترین زندگی عمل اور مقاصد آفرینی کی زندگی نہیں بلکہ عقل کل کا تماشائی ھونا ھے ۔ خدا جو تمام وجود کا ماخذ اور نصب العین ھے وہ بھی غیر متحرک اور غیر فاعل ھے ۔ دنیا کی زندگی حقیقت کا سایہ ھے یا ھندوؤں کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ مایا ھے یا حقیقت کے مقابلے میں بے مایہ ھے ۔

اقبال افلاطون کے اس نظریۂ وجود کا شدید مخالف ھے ۔ وہ اس کو اساسی طور پر غلط قرار دیتا ھے ۔ اور اس کا خیال ھے کہ اسی نظریۂ وجود کے زیر اثر زندگی سے فرار کے نظریات پیدا ھوئے ھیں جن سے انسانی زندگی ارتقا اور تخلیق سے محروم ھو گئی ھے ۔ اقبال کے نزدیک وجود کی حقیقت عقل نہیں بلکہ عمل ھے ۔ عقل عمل سے پیدا ھوتی اور اس کا آلۂ کار بنتی ھے ۔ اصل حیات تسخیر و تخلیق اور مقاصد آفرینی ھے ۔ وجود کی حقیقت ایک انائے مطلق ھے جو خلاق ھے اور یہ 'انا' اپنی مسلسل خلاق میں لاتعداد انا یا نفوس مقاصد کوش پیدا کرتا ھے ۔ زندگی جذبۂ آفرینش ھے ۔ عمل آفرینش ھی سے اس کو اپنا عرفان حاصل ھوتا ھے اور عمل ھی اس کی لامتناھی تکمیل کا ذریعہ ھے ۔ سکون سے زندگی کا تماشا کرنے سے زندگی کی ماھیت معلوم نہیں ھو سکتی کیونکہ زندگی ایک مسلسل حرکت ھے اور عقل کے تصورات ازلی طور پر ساکن اور جامد ھیں ۔ ساحل افتادہ نہ اپنی ماھیت سے آشنا ھو سکتا ھے اور نہ اس دریا کی حقیقت سے جو اس کے آغوش میں متلاطم ھے ۔ اقبال نے اپنا یہ نظریہ کس خوبصورتی اور بلاغت سے بیان کیا ھے ۔

ساحل افتاده گفت گر چه بسے زیستم هیچ نه معلوم شد آه که من کیستم
موج زخود رفته اے تیز خرامید و گفت هستم اگر میروم گر نه روم نیستم

افلاطون کے هاں موج متحرک هے، لیکن موج کا عقلی تصور ساکن هے ۔ اور یه ساکن عقلی تصوُر متحرک موج کے مقابلے میں زیاده حقیقی هے ۔

تموج کے مقابلے میں اس کا محض تصور قائم کرنا ایک الهی انداز هے ۔ عاقل کا وظیفهٔ حیات یهی هونا چاهئیے که وه خود تهپیڑے نه کهائے بلکه عقل کے ساحل پر بیٹها هؤا سبکسار هو کر اس کے غیر متغیر اور غیر متموج تصور میں اپنے تئیں کهو کر پنی حقیقت کو پائے ۔ اقبال کے هاں زندگی مقدم هے اور عقل مؤخر ۔ زندگی جو کچھ پیدا کرتی هے عقل بعد میں اس کا جائزه لے کر اس میں قواعد و ضوابط کو ڈهونڈتی هے ۔ حریم حیات میں عقل حلقهٔ بیرون در هے ۔ وه آستان سے دور نهیں هے ۔ لیکن اس کی تقدیر میں حضور نهیں هے ۔ زندگی آپ اپنا نور پیدا کرتی هے ۔ لیکن اس نور کو اگر عقل نار حیات سے الگ کر کے ایک ازلی مجرد حقیقت سمجھ لے تو معقولات ظلمت کده بن جاتے هیں ۔ زندگی کا آب حیات تاریکی میں گم هو جاتا هے ۔ اسی لئے اقبال افلاطون کی بابت کهتا هے که :

رخش او در ظلمت معقول گم در کهستان وجود افگنده سم
آنچناں افسون نا محسوس خورد اعتبار از دست و چشم و گوش برد*

---

*ترجمه : هؤا رهوار اسکا فلسفه کی ظلمتوں میں گم
نه کوهستان هستی میں جمے اسکے کهیں پر سم
کیا یوں سر په نا محسوس کا جادو سوار اس نے
که چهینا هاتهه، کان اور آنکهه سے سب اعتبار اس نے

اقبال کہتا ھے کہ محسوس کو نا محسوس کے مقابلے میں بے حقیقت قرار دینا انسان کو عالم رنگ و بو سے بے تعلق کر دیتا ھے۔ اسی سے فرار اور گریز پیدا ھوتا ھے اور رھبانیت کو تقویت حاصل ھوتی ھے جس کی نفس کشی حیات کشی کے مرادف ھے۔ اور اسی لئے اسلام نے مرد مومن کو اس سے بچنے کی تلقین کی ھے۔ قرآن کریم کی تعلیم ھے کہ مظاھر وحوادث انفس و آفاق آیات اللہ ھیں۔ یہ سراسر حقیقت ھیں۔ نہ باطل ھیں، نہ فریب ادر اک! اور نہ اس سے گریز کر کے عرفان نفس یا عرفان خدا حاصل ھو سکتا ھے۔ تصوف کے ایک حصے پر افلاطونی رنگ چڑھ گیا اور صوفی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ :

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند گر نہ بینی نور حق برمن بخند

اقبال اس افلاطونی تصوف کے خلاف آواز بلند کرتا ھے جو عالم محسوسات کو مایا قرار دے اور خلقت کو باطل ٹھہرائے۔

بر تخیلہائے ما فرماں رواست جام او خواب آور و گیتی رباست
گو سفندے در لباس آدم است حکم او بر جان صوفی محکم است*

مسلمانوں کے متصوفانہ فلسفے نے افلاطون کے اعیان ثابتہ یا ازلی غیر متغیر معقولات کو اپنے فکر کا جزو لاینفک بنا لیا جس کا نتیجہ اقبال کے نزدیک یہ ھؤا کہ صوفی بھی ھنگامۂ

---

* تخیل پر ھمارے حکمراں ھے آب و تاب اس کی
سلا کر، دور کر دیتی ھے دنیا سے، شراب اس کی
نہیں تھا آدمی کے بھیس میں اک بھیڑ سے بڑھکر
مسلط ھیں مگر افکار اس کے قلب صوفی پر

موجود کا منکر اور اعیان نا مشہود کا پرستار ہو کر بود کو نا بود اور نابود کو بود کہنے لگا۔ لیکن اس قسم کا گیتی گریز تصور خود سقراط، افلاطون اور ارسطو کی زندگیوں پر کوئی سلبی اثر نہ ڈال سکا۔ یہ تینوں مفکرین، اخلاقیات اور سیاسیات پر گہری بحثیں کرتے رہے اور اپنے اپنے انداز میں کوشاں رہے کہ معاشرے کو زیادہ عاقلانہ اور عادلانہ اصول پر از سر نو تعمیر کیا جائے۔ جماعت کی حکمرانی اور نگرانی سقراط اور افلاطون ایک ایسے منتخب گروہ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں جو عقل اور ایمان کے کما حقہ تحقق کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ سے تزکیۂ نفس کر چکے ہوں۔ اقبال نے اسرار خودی میں افلاطون کے نظریۂ حیات کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ افلاطون کے وسیع عالم فکر کا فقط ایک پہلو ہے، جو قارئین افلاطون کی زندگی اور اس کی وسعت فکر سے ناآشنا ہیں ان کو اسرار خودی کے ان اشعار سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ افلاطون فرد اور جماعت کے مسائل اور معاملات کو بے حقیقت سمجھتا ہے اور عالم انسانی کو اعیان ثابتہ یا مجرد معقولات کی افیون کھلا کر بے حس اور بے عمل بنانا چاہتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے واقعات اس کے بالکل بر عکس رہے ہیں۔ اس مختصر سی تمہید میں اس کی گنجائش نہیں کہ اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا جائے کہ افلاطون سے لیکر آخری معاشرتی انقلاب، یعنی اشتراکیت تک، سوسائٹی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی جو فکری یا عملی کوششیں ہوئی ہیں وہ کم و بیش افلاطونی افکار سے متأثر ہیں۔ اقبال نے ایام شباب میں اپنے متعلق یہ کہا تھا:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے ' کچھ سنبل نے، کچھ گل نے،
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑالی طوطیوں نے، قمریوں نے، عندلیبوں نے،
چمن والوں نے ملکر لوٹ لی طرز فغاں میری

بعینہ یہی کچھ افلاطون کے ساتھ ہؤا ۔ مشرقی فلسفہ کے متعلق خواہ کچھ کہئے لیکن مغربی فلسفہ کے متعلق تو یہ کہنا نا درست ہوگا کہ وہ تمام کا تمام دنیا سے گریز کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن مغرب کے عظیم نظامات فکر کےمتعلق ہانرش رکرٹ جیسے جرمن مفکر اور وھائٹ ہیڈ جیسے انگریز فلسفی کی رائے ہے کہ یہ سب کے سب افلاطون ھی کی تشریحات ھیں ۔ مارکس، لینن، مسولینی اور ھٹلر جیسے معاشرتی انقلاب کے آرزومند ' اوز اپنے عمل سے دنیا کو تہ و بالا کرنے والے ۔ خواہ اس کا نتیجہ تخریب ہو یا تعمیر ۔ افلاطون ھی کی کتاب سے کچھ کچھ ورق اڑاتے رہے ھیں ۔ دوسری طرف رومن کیتھولک کلیسا کی تنظیم بھی بہت کچھ اس کے افکار کا عکس ہے ۔ سقراط جس کی زبان سے افلاطون نے اپنا نظریۂ حیات بیان کیا ہے ، اصلاح معاشرت کی کوشش میں شہید ہو گیا ۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اقبال نے افلاطون کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔ اقبال نے فقط یہ دیکھا کہ افلاطونی افکار کا اثر بعض لوگوں پر اچھا نہیں ہؤا اور اس کے نظریۂ وجود سے ، فرار عن الحیات کا نتیجہ از روئے منطق حاصل ہوتا ہے ۔ جس قسم کے حیات گریز تصوف کو اقبال نے مسلمانوں کے لئے افیون قرار دیا وہ افلاطون سے کہیں زیادہ فلاطینوس اسکندروی سے حاصل کردہ ہے جس کے افکار کا

اسلامی فلسفۂ اشراق اور عیسوی تصوف پر گہرا نقش نمایاں ہے۔ افلاطون راہب نہیں تھا۔ اور نہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے متوازی اور متناسب طور پر لطف اٹھانے والے یونانی اس مزاج کے تھے۔ وہ خود بھی اپنے مجرد تصورات میں گم ہو کر علائق حیات سے بے تعلق نہیں ہؤا۔ اس کا گھر ایشیا کی تمام علمی اور عملی زندگی کا مرکز تھا۔ ایسے شخص کے متعلق جو عدل کا ایک انقلابی تصور قائم کر کے اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں سائراکیوز کی ریاست سے خارج کیا گیا ہو اور بحری ڈاکوؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہو، یہ کہنا نا انصافی معلوم ہوتی ہے کہ:

ذوق روئیدن ندارد دانہ اش　از طپیدن بے خبر پروانہ اش
راہب ما چارہ غیر از رم نداشت　طاقت غوغائے ایں عالم نداشت
دل بسوز شعلۂ افسردہ بست　نقش آں دنیائے افیوں خوردہ بست*

حقیقت یہ ہے کہ اس نے زندہ قوموں کو ذوق عمل سے محروم نہیں کیا اور نہ تندرست ملتوں کو مسموم کیا۔ بلکہ جو قومیں مختلف اسباب سے زندگی سے محروم اور بے عملی یا بد عملی سے مسموم ہو چکی تھیں، انہوں نے افلاطونی افکار کی انحطاط

---

*جسے کاچھ ذوق اگنے کا نہیں وہ دانہ ہے اس کا
تڑپنے کے مزے سے بے خبر پروانہ ہے اس کا

جہاں کے شور و غوغا سے سرا سیمہ ہؤا ایسا
سوائے بھاگ جانے کے نہ اس راہب کو کاچھ سوجھا

ہؤا افسردہ شعلے سے حرارت کا تمنائی
اسے افیون کی پروردہ اک دنیا پسند آئی

انگیز تاویل کرلی ۔ افلاطونی فلسفے کا بھی اسی قسم کا حشر ہؤا جو اسلام میں نظریۂ تقدیر کا ہؤا ۔ جب تک مومنوں میں قوت ایمان، قوت عمل اور تنظیم حیات صالحہ موجود تھی اس وقت تک تقدیر کا تصور ان کی قوت عمل و ایثار کو تقویت پہنچاتا تھا ۔ اس کے بعد عشرت پسندوں اور تن آسانوں نے ترک سعی کو توکل سمجھ لیا اور سب کچھ مقدر ہونے کی وجہ سے سعی کو بے کار جاننے لگے ۔ اس میں قرآن کریم کی تعلیم تقدیر کا قصور نہ تھا بے عملی نے اپنی غلط تاویلوں کو اسلام بنا لیا تھا ۔

اقبال کے معاصرین میں خودی کے فلسفہ کو پیش کرنے والے اور بھی اکابر مفکرین ہیں جن کے افکار سے اقبال پوری طرح آشنا تھا ۔ ان میں سے بعض کا مداح اور بعض سے کم و بیش متأثر بھی تھا ۔ نطشے ، فشٹے ، برگسان اور ولیم جیمز کے نظریات ماہیت وجود بہت کچھ وہی ہیں جو اقبال کی تعلیم میں بھی ملتے ہیں ۔ اس سے بعض نقادوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اقبال ان کا مقلد تھا ۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے ان مفکرین سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن یہ اقبال کے کمال پر کوئی دھبا نہیں ۔ اقبال ان سب سے کسی ایک پہلو میں متفق ہے اور کسی دوسرے اساسی پہلو میں شدید اختلاف رائے بھی رکھتا ہے ۔ جہاں تک نطشے کا تعلق ہے ، میں اس کے متعلق اپنے مقالہ 'نطشے ، رومی اور اقبال، (مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو) میں مبسوط بحث کر چکا ہوں جسے یہاں دھرانا نہیں چاہتا ۔ اقبال کا ایک مخصوص انداز فکر اور نظریۂ حیات تھا ۔ اس نخل کی پرورش اس نے مختلف عناصر سے کی ۔ ان میں سے کچھ عناصر خاص قرآنی تعلیم کے ہیں ، کچھ

رومی کی صوفیانہ تاویل اور روحانی تجربے کے ، کچھ مغرب کے ان مفکرین کے افکار کے ، جن کا اقبال ہم نوا ہے یا جو اقبال کے ہم صفیر ہیں ۔ اقبال کا مغربی فلسفہ کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا تھا ۔ اس میں سے جو کچھ اس کے خاص فلسفۂ حیات کے مطابق تھا اس نے اخذ کیا اور جو کچھ اس سے متخالف تھا اس کو رد کر دیا ۔ اقبال جیسے کسی مفکر کا کلام ہو یا کوئی مذہبی صحیفہ ہو، اس کی خوبی اور کمال یہ نہیں ہوتا کہ اس میں وہ باتیں درج ہیں جو دوسروں نے نہ کہی ہوں ۔ پہلی تعلیموں کے بیش بہا عناصر اس میں موجود ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کی ترکیب ایک نئے حیات آفرین انداز سے ہوتی ہے ۔ سنگ و چوب و خشت ہر تعمیر میں کم و بیش ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں ۔ لیکن مہندس اور معمار کا کمال اپنے ہنر اور تصور سے اس میں مخصوص قسم کی آسائش اور زیبائش پیدا کر دیتا ہے ۔ گوئٹے نے ایکٹر من سے دوران گفتگو میں ایک مرتبہ کہا کہ ''لوگ بڑے بڑے مفکرین کے افکار کا تجزیہ کرنے لگ جاتے ہیں اور الگ الگ عناصر کا ماخذ بتانا ان کا شیوۂ تحقیق ہوتا ہے ۔ لیکن کیا اس سے ایک بڑے فن کار یا مفکر کی انفرادی شخصیت یا اس کی مخصوص اپج کا اندازہ ہو سکتا ہے؟ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص گوئٹے کی تحلیل اور تجزیہ اس طرح کرے کہ اس نے اتنے بکرے ، اتنی سبزی ترکاری اور اتنی گندم کھائی ۔ ان سب کو ملا کر گوئٹے بن گیا ۔ لہذا گوئٹے کی ماہیت سمجھ میں آ گئی''۔

اسرار خودی میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ، ان

مفکرین مغرب کے افکار کا پر تو نظر آتا ہے جو اقبال کے ہم مزاج ہیں اور جن کے افکار کے کسی پہلو کو اقبال نے اپنے نظریۂ حیات کا مؤید سمجھا ہے ۔ مثلاً اس بیان میں کہ اصل نظام عالم خودی ہے اور تعینات وجود کی ذمہ دار بھی خودی ہے وہ مشہور جرمن فلسفی فشٹے کا ہم نوا ہو کر کہتا ہے کہ کائنات کا وجود یا پیکر ہستی خودی ہی کا نتیجہ ہے۔ عالم ادراک اور عالم آب و گل، یا تصوف کی زبان میں یوں کہئے کہ ماسوا کا وجود، خدا کی خودی سے سرزد ہؤا ہے ۔ خودی کا اثبات نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ خودی اپنا غیر پیدا نہ کرتی ۔ خودی کی ماہیت خلاقی اور ورزش ارتقا ہے۔ نفئی اثبات خود اثبات کا تقاضا ہے ۔ جس غیر کو خودی نے اپنے ممکنات وجود کو ظہور میں لانے کے لئے خلق کیا ہے وہ ایک لحاظ سے غیر ہے اور دوسرے لحاظ سے خودی ہی کا مظہر ہے ۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او غیر او پیدا ست از اثبات او
در جہاں تخم خصومت کاشت است خویشتن را غیر خود پنداشت است
سازد از خود پیکر اغیار را تا فزاید لذت پیکار را*

اقبال کہتا ہے کہ یہ ایک طرح خودی کی خود فریبی ہے۔ اقبال جس خودی کا ذکر کرتا ہے وہ انسانوں کے انفرادی انا کی

---

* جہانوں کے جہاں لپٹے پڑے ہیں ذات میں اس کی
وجود اس کا اگر مانیں تو پھر ہے غیر کی ہستی
سمجھنا غیر اپنے آپ کو اس کا قیامت ہے
اسی سے اس نے بویا دھر میں تخم خصومت ہے
یہ اپنے آپ سے کرتی ہے پیکر غیر کا پیدا
کہ بڑھ جائے مزا جنگ و جدل کا اور تھوڑا سا

خودی ھی نہیں بلکہ خدا کی خودی ھے ، جو مصدر خلقت ھے۔ مسلمہ اسلامی عقیدۂ توحید عام طور پر اس انداز سے بیان نہیں ھوتا ۔ اسرار خودی کے عام قارئین نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی کہ اقبال جس مطلق خودی کا ذکر کر رھا ھے وہ وجود مطلق اور ذات واجب‌الوجود کی ماھیت ھے ۔ لیکن خدا کی نسبت مومن یہ کس طرح گوارا کریگا کہ اس قسم کے عقائد بیان ھوں کہ آفرینش حیات و کائنات سے خدا نے ورزش ارتقا کی خاطر تخم خصومت بویا ھے ور عالم آفرینی ایک طرح کی خود فریبی ھے ۔ حقیقت یہ ھے کہ اقبال کے ھاں وجود سرمدی کا تصور عام توحید پرستوں سے بہت کچھ الگ ھو گیا ھے ۔ خدا 'الان کماکان' بھی ھے اور 'کل یوم ھو فی شان' بھی ! اقبال نے خدا کا لا تبدیل سرمدی پہلو نظر انداز کر دیا ھے اور مسلسل تغیر اور ارتقا اور لا متناھی خلاق کی صفت اس پر بہت زیادہ منکشف ھوئی ھے ۔ وہ صوفیاء کرام کے اس مقولے یا روحانی تجربے کا بھی شیدائی ھے کہ تجلی میں تکرار نہیں ۔ وجود کے یکے بعد دیگرے آنے والے کوئی دو کوائف ھم رنگ نہیں ھوتے خلاق کا قدم ھر دم آگے ھی کی طرف اٹھتا ھے ۔ ذات مطلق کی خودی کو اپنی تکمیل مقصود ھے ۔ اپنے اثبات اور ارتقا کی خاطر وہ ھستیوں کو وجود میں لاتی اور ساتھ ھی ساتھ مٹاتی بھی جاتی ھے ۔ زندگی کے طویل ارتقا میں لاتعداد اقسام کے پھول معرض وجود میں آ کر نابود ھو گئے ھونگے ، پیشتر اس کے کہ گلاب کا ایک پھول ظہور میں آ سکے ۔ حیات و کائنات میں جو درد و کرب، جور و ستم اور شر دکھائی دیتا ھے،

اقبال کا نظریۂ خودی اس کی ایک توجیہ ہے۔

عذر ایں اسراف و ایں سنگیں دلی خلق و تکمیل جمال معنوی*

صدیوں سے اسلامی تصوف میں وحدت وجود کا جو نظریہ کسی قدر فروعی اختلافات کے ساتھ، اکثر اکابر صوفیہ کی تعلیم میں ملتا ہے، اقبال اس سے گریز کرتا رہا کیونکہ اس سے انسان خیر و شر اور تمام حوادث کو ایک ذات کا مظہر سمجھ کر زندگی کی جد و جہد کو بے کار سمجھنے لگتا ہے یا بقول ولیم جیمز وحدت وجود میں خیر و شر یک رنگ ہو کر اخلاق کو تعطیل حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اقبال کے ذہن میں وحدت وجود کا نظریہ دوسرے رنگ میں ابھرتا ہے۔ ہستئی مطلق کی ماہیت خودی ہے۔ 'ماسوا' اس کے اظہار ذات کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ماسوا بھی خدا کے سوا کچھ نہیں۔ اگرچہ عمل کی خاطر خدا اس کو اپنا غیر سمجھ لیتا ہے کیونکہ یہ خود فریبی عین حیات اور باعث تکمیل حیات ہے۔ ورنہ اصلیت یہ ہے کہ:

می شود از بہر اغراض عمل
عامل و معمول و اسباب و علل
خیزد، انگیزد، برد، تابد، رمد
سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد†

---

* اسی خاطر یہ بن جاتی ہے مسرف اور پتھر دل
کہ طے کر لے جمال معنوی تکمیل کی منزل

† یہ بھر لیتی ہے کیا کیا روپ سر گرم عمل ہو کر
عیاں ہے عامل و معمول و اسباب و علل ہو کر
یہ اٹھتی ہے، اٹھاتی ہے، چمک کر بھاگ جاتی ہے
یہ جل کر، جگمگا کر، مار کر، مر کر، دکھاتی ہے

بظاہر یہ انداز بیان اس سے کچھ زیادہ متمائز معلوم نہیں ہوتا جسے ایک قدیم وحدت الوجودی صوفی وجد و مستی میں آکر گاتا ہے کہ

خود کوزۂ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ
خود بر سر آں کوزہ خریدار بر آمد
بشکست و رواں شد

اقبال کے ہاں ذات مطلق کی ماہیت خودی ہے۔ خودی ایک انا یا ایغو (Ego) کے بغیر متصور نہیں ہو سکتی۔ اس مطلق خودی نے ذوق نمود اور ورزش وجود میں اپنے اندر سے لاتعداد انا یا ایغویا خودی کے مراکز خلق کئے ہیں۔ یہ تصور مشہور حدیث قدسی کے اس تصور سے کسی قدر مشابہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق یہ انکشاف کرتا ہے کہ 'کنت کنزاً مخفیا۔ فا حببت ان اعرف۔ فخلقت الخلق'۔ (میں ایک خزینۂ پنہاں تھا۔ میں نے چاہا کہ میں ظاہر ہوں اور پہچانا جاؤں۔ اس لئے میں نے خلقت کو خلق کیا)۔

وانمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است*

خودی کی ماہیت کو جاننا عرفان نفس بھی ہے اور عرفان رب بھی۔ اور اس عرفان میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زور خودی سے حیات عالم وابستہ ہے اور ہر انفرادی نفس کی استواری اس کی زندگی کی ضامن ہے۔ جو قطرہ شبنم بنتا ہے وہ چند لمحوں میں خودی

---

* یہ عادت ہے خودی کی، اپنے جوہر کو کرے افشا
ہے اسکی قوتوں کا ذرے ذرے میں چھپا سوتا

کے ضعف کی وجہ سے نابود ہو جاتا ہے۔ جو قطرہ اشک بنتا ہے وہ ٹپک کر ناپید ہو جاتا ہے۔ لیکن جو قطرہ صدف نشین ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے وہ گوہر بن جاتا ہے، جس کی موج نور تلاطم قلزم میں بھی منتشر نہیں ہوتی۔ اقبال فطرت کے مظاہر میں سے اپنے اس نظریہ کی بہت سی دلکش مثالیں پیش کرتا ہے۔ زمین کا وجود قمر کے مقابلے میں محکم تر ہے، اس لئے چاند اس کے گرد طواف کرتا ہے۔ سورج زمین کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس لئے زمین اس سے مسحور ہو کر اس کے گرد چکر کاٹتی رہتی ہے۔

اقبال رہبانیت کے خلاف جہاد کرتا ہے اور جتنے رہبانی تصورات عجمی تصوف کے راستے سے اسلامی افکار کا جزو بن گئے ہیں، ان سے وہ ملت کا دامن چھڑانا چاہتا ہے۔ قناعت اور توکل اور تسلیم و رضا کے غلط معنی لے کر مسلمانوں میں بھی یہ تصور عام ہو گیا کہ نفس کشی کے معنی تمام آرزؤں کا قلع قمع کرنا ہے۔ انسان جتنا بے آرزو اور بے مدعا ہوتا جائے اتنا ہی خدا کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ غالب نے یہی متصوفانہ خیال اس شعر میں ظاہر کیا ہے کہ :

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

اسی سے ملتا جلتا صائب کا ایک شعر ہے :

حق را ز دل خالی از اندیشہ طلب کن
از شیشۂ بے مے مئے بے شیشہ طلب کن

یہ خیال ہندومت اور بدھ مت کی الہیات میں بھی ایک مسلمہ بن گیا تھا کہ اپنی خودی کو صفر کر دینے سے انسان خدا کا ہم ذات ہو جاتا ہے ۔ یا خود خدا بن جاتا ہے ۔ بھگوت گیتا میں ارجن کرشن سے پوچھتا ہے کہ تم خدا کیسے بن گئے ؟ وہ جواب دیتا ہے :

من از ہر سہ عالم جدا گشتہ ام
تہی گشتہ از خود خدا گشتہ ام (ترجمۂ فیضی)

اقبال کی تعلیم اس کے بالکل بر عکس ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ خود خدا کی ماہیت خودی ہے اور خودی کی ماہیت مقصد آفرینی اور مقصد کوشی ۔ 'تخلقو با خلاق اللہ' کی تعلیم کے مطابق انسان کو بھی تخلیق مقاصد سے اپنی خودی کو استوار کرنا چاہئے ۔ اس تعلیم میں وہ اپنے مرشد رومی کا ہم خیال ہے ۔ رومی کہتا ہے کہ زمین و آسمان کی خلقت حاجت کی پیداوار ہے ۔ حاجت ہی سے ہستی کی آفرینش اور اس کا ارتقا ہوتا ہے ۔ اس لئے وہ نصیحت کرتا ہے :

پس بیفزا حاجت اے محتاج زود

اسی خیال کو اقبال نے طرح طرح کے لطیف پیرایوں میں ادا کیا ہے ۔ مثلاً

زندگانی رابقا از مدعاست کاروانش را درا از مدعاست*

زندگی جستجو اور آرزو کا نام ہے ۔ عالم آب و گل اور جہان رنگ و بو

---

* بقائے زندگانی کے لئے ہے مدعا لازم
ہے اسکے کارواں کو ایک منزل کی درا لازم

سب آرزو کے رھین اور امین ھیں ۔ فلسفۂ جدید میں ارتقا کے طرح طرح کے نظریات پیدا ھوئے ۔ ان نظریات میں سے برگساں کا نظریۂ ارتقاء تخلیقی اقبال کے خیالات کے عین مطابق ھے ۔ اعضا سے وظائف اعضا پیدا نہیں ھوتے ۔ بلکہ حیات کی ارتقائی تمنائیں اعضاؤ آلات میں صورت پذیر ھوتی ھیں ۔ یہ نہیں کہ آنکھ ڈارونی اتفاقات اور میکانیکی توافق سے بن گئی اور اس سے بینائی ممکن ھو گئی ۔ اقبال کہتا ھے کہ علت و معلول کا سلسلہ یہاں برعکس ھے ۔ لذت دیدار اور شوق بینش نے آنکھ بنائی ھے ۔ ذوق رفتار نے پاؤں بنائے اور ذوق نوا نے منقار ۔ اقبال نے اسرار خودی میں بھی اور بعد کے کلام میں بھی سینکڑوں دلکش اور بصیرت افروز اشعار عشق اور عقل کے موازنہ اور مقابلہ میں لکھے ھیں ۔ یہ صوفیا اور بعض حکما کا قدیم مضمون ھے ۔ لیکن اس مسئلے پر اقبال کے ھاں جس قدر بصیرت اور ندرت پائی جاتی ھے وہ اور کہیں نہیں ملتی ۔ یہ اس کا خاص مضمون بن گیا ھے اور اس مضمون کے ھر شعر میں اقبال کے کلام میں حکمت کے ساز کے ساتھ وجد و مستی کا سوز توام ھو گیا ھے ۔ میلان حیات اور آرزوئے ارتقا اس کے ھاں ماھیت وجود ھیں ۔ یہی اصل ھیں اور باقی جو کچھ ھے، عقل ھو یا علوم و فنون یا آئین و رسوم، سب کی حیثیت فروعی اور ثانوی ھے ۔ صحیفۂ وحئی آسمانی ھو یا صحیفۂ فطرت، اس علم الوجود یا علم الکتاب کے مقابلے میں عشق ام الکتاب ھے ۔ اصل ماخذ زندگی اور اس کی سعئی تکمیل ھے ۔ اجرام فلکیہ ھوں یا اجسام حیوانیہ یا شعور و ادراک، یہ سب زندگی نے اپنی بقا کے لئے آلات بنائے ھیں ۔ علم و فن خود

مقصود نہیں اور عقل انسان کا معبود نہیں ۔ یہ سب کچھ نمود ہے بود نہیں ۔

علم و فن از پیش خیزان حیات ، علم و فن از خانہ زادان حیات*

انسان کا کام صحیفۂ کائنات کی تفسیر نہیں بلکہ موجودات کی تسخیر ہے ۔ انسان کا فرض ہے کہ ما سوا کی تسخیر کرے اور خود اپنے آپ کو مسخر ہونے سے بچائے اور ما سوا کی تسخیر سے آگے قدم بڑھاتا ہؤا اس وقت تک دم نہ لے جب تک کہ خدا یعنی ذات مطلق کی خودی کو مسخر کر کے اپنا نہ لے ۔ اس بارے میں بھی وہ رومی کا ہم آہنگ ہے، جو کہتا ہے :

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اسی مضمون کو اقبال نے اپنے ایک شعر میں ڈھالا ہے :

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال کے ہاں خودی اور عشق کے مضامین ہم معنی ہیں ۔ ایک ہی چیز ہے جس کو کبھی وہ خودی کہتا ہے اور کبھی عشق ۔ اگرچہ اسرار خودی میں اس نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ 'خودی عشق سے استوار ہوتی ہے' ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خودی جس عشق سے استوار ہوتی ہے وہ کس ہستی یا کس چیز کا عشق ہے ۔ کیا خودی کو اپنے سے خارج کسی

---

* جنم لیتے ہیں گھر میں زندگی کے علم و فن سارے
حضور زندگی ہیں با ادب خادم یہ بیچارے

محبوب کو تلاش کرنا ہے یا خودی کے خود اپنے میلانات کے اظہار کا نام عشق ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کے اندر لامتناہی ممکنات مضمر ہیں۔ خودی کو استوار کرنا ان ممکنات کو بطون سے شہود میں لانا ہے۔ عشق خودی کی ماہیت ہے اور اپنی ذات سے باہر کسی محبوب کا گرویدہ ہونا نہیں ہے۔ خودی ارتقا طلب ہے۔ وہ ہر حاصل شدہ کیفیت سے آگے بڑھنا چاہتی ہے۔اس کو اپنے ارتقا سے عشق ہے۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت چشم اگر داری بیا بنما یمت
عاشقان او ز خوباں خوب تر خوشتر و زیبا ترو محبوب تر*

ہاں ایک طریق خودی کی استواری کا، جس کا اقبال بڑی شدت کے ساتھ قائل ہے، یہ ہے کہ جن ہستیوں نے اپنی خودی کے ممکنات کو وجود پذیر کیا ہے اور اپنی خاک کو رشک افلاک بنایا ہے ان سے عشق پیدا کیا جائے۔ایسے بزرگوں کے عشق سے انسان کی خودی فرومائگی نہیں بن جاتی بلکہ معشوق کی خودی کا رنگ عاشق پر چڑھ جاتا ہے۔ انبیا کا کام یہ نہیں ہوتا کہ امت کے افراد کی خودی کو عجز میں تبدیل کر دیں۔ انبیا خود احرار ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے چھڑا کر مردان حر بنانا چاہتے ہیں۔ اقبال کہتا ہے کہ خاتم النبین محمد مصطفیٰ صلعم نے شبستان حرا میں خلوت گزیں

---

* ہے تیرے دل کی گہرائی میں اک معشوق پوشیدہ
دکھا سکتا ہوں تجھ کو میں جو تو ہو صاحب دیدہ
حسیں تر ہیں حسینوں سے بھی اسکے عشق کے مارے
بہت دلکش، بہت رعنا، بہت بانکے، بہت پیارے

ہوکر اپنی خودی کے جوہر کو چمکایا۔ قوم و آئین و حکومت اسی جوہر کی کرنیں ہیں۔ دین کا جوہر ان معنوں میں عشق یا محبت ہے کہ مرد مومن تمام افراد اور اشیاء سے قلبی تعلق پیدا کر کے کائنات کی خودی کی وحدت کا ثبوت دیتا ہے۔ دوسروں سے محبت کرتا اور دوسروں کو اپنا ہم ذات سمجھتا ہے۔ اس طرح سے محبت کے ذریعے خودی قوی تر اور وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ خودی کا اصل انداز عمل مخاصمانہ یا رقیبانہ نہیں بلکہ عاشقانہ ہے۔

خودی کے ضمن میں اقبال نے یہ تحقیق کی ہے کہ نفئی خودی کی تعلیم کہاں سے پیدا ہوئی اور کن اسباب سے وہ بعض اقوام پر چھا گئی۔ اس تحقیق میں اقبال نطشے سے متفق ہے کہ یہ انحطاط یافتہ اور مغلوب اقوام کی ایجاد ہے۔ جن اقوام کے قوائے حیات سست پڑ جاتے ہیں، ان سست عناصر اقوام کو قوی اور جلیل اقوام کے مقابلے میں زندہ رہنے کی کوئی ترکیب سوچنی پڑتی ہے۔ زبردست اقوام تسخیر پسند ہوتی ہیں۔ زبردستوں کے ہتھیار اور ہوتے ہیں اور کمزوروں کے ہتھیار اور۔ کمزور کبھی تو فریب اور خوشامد سے کام نکالتا ہے۔ اور کبھی وہ ایسے نظریات کی تبلیغ کرتا ہے جس سے اس کی کمزوری ذلت کی بجائے فضیلت دکھائی دینے لگے۔ اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے وہ فقر کو سراہنے لگتا ہے۔ ہمت کو دنیا طلبی اور عجز کو روحانیت کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اپنی تعلم میں وہ ایسی دلکشی اور لطافت پیدا کرتا ہے کہ اہل ہمت بھی یہ افیون کھانے لگتے ہیں۔ یہ مضمون نطشے کا خاص مضمون ہے اور

اس نے اسی نقطۂ نظر سے عیسائیت پر اور اس کے پیدا کردہ اخلاقیات پر بھرپور وار کیا ہے۔ عیسوی رہبانیت کی یہ تعلیم کہ جنت ضعیفوں اور عاجزوں کو ملیگی اور صاحبان ہمت و ثروت و جبروت اس میں داخل نہ ہو سکینگے، نطشے کے نزدیک نوع انسان کو قعر مذلت میں دھکیل گئی اور مغرب میں شیروں کو بکرا بنا گئی۔

جنت از بہر ضعیفان است و بس قوت از اسباب خسران است و بس
جستجوئے عظمت و سطوت شر است تنگدستی از امارت خوشتر است*

یہ سازش مغلوب اور کمزور اقوام کسی شعوری تدبیر اور تنظیم سے نہیں کرتیں بلکہ ان کی کمزوری غیر شعوری طور پر ان کے تحفظ کے لئے یہ آلات وضع کرتی ہے۔ اقبال نے کہیں عجمی تصورات کو اور کہیں افلاطونی نظریات کو، ادبیات و حیات اسلامی کو مسموم کرنے کا ذمہ دار ٹھرایا ہے۔ اسلامی سیاست کی تاریخ میں ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ یہود و نصاریٰ اور بعض عجمی گروہوں نے، اسلام سے مغلوب ہونے اور ظاہر میں اسلام کو قبول کرنے کے بعد، اس کی بیخ کنی کے لئے نہایت پوشیدہ اور لطیف ذرائع اختیار کئے۔ بعض تصورات فلسفہ اور تصوف کے انداز میں پیش کئے گئے اور بعض تصورات

---

* ضعیفوں کے لئے اللہ نے جنت بنائی ہے
ہو پونجی جسکی طاقت، اسکی گھاٹے کی کمائی ہے
تلاش سطوت و عظمت میں شر کی ہے عملداری
امارت سے ہیں بہتر تنگدستی اور لاچاری

موضوع احادیث نبوی کے پیرائے میں ۔ متحققین حدیث نے ان مخترعات اور موضوعات کو بہت کچھ چھانٹا لیکن اس کے باوجود ایسی چیزیں مروجہ طور پر مسلم احادیث میں ایسی ملتی ھیں جن پر شبہ ھوتا ھے کہ یہ غیر اسلامی تصورات کو اسلام میں داخل کرنے کی سازش کا نتیجہ ھیں۔ عام ادبیات اسلامیہ میں ایسے ایسے زوایائے نگاہ مسلمات میں داخل ھو گئے جنہوں نے مسلمانوں کو زندگی کی جدو جہد سے باز رکھا ۔ قناعت پرستی، لذت پرستی، سکون پرستی، قطع علائق، انسان کو خود داری سے محروم کرنے والے تصورات عشق، ھوس پرستی، مصنوعی محبت، ادبیات کا تارو پود بن گئے ۔ ایسا ادب قوم کے انحطاط کی علت بھی ھے اور اس کا معلول بھی ۔ کسی قوم کا ادب اس کی زندگی اور اس کی تمناؤں کا آئینہ دار ھوتا ھے ۔ جب قوم پست ھمت اور سست عناصر ھو جائے تو ادب میں زندگی کی گرمی اور عمل کا جوش نظر نہیں آتا ۔ عاشق خود دار کی بجائے 'آوارۂ و مجنونے رسوا سر بازارے' انسانیت کا دلکش نمونہ بن جاتا ھے ۔ فارسی اور اردو کا عام تغزل زیادہ تر اسی انحطاط کا آئینہ دار ھے ۔ ایسی شاعری کے خلاف پہلے حالی نے شدید احتجاج کیا اور کہا کہ قیامت کے روز باقی گنہگار تو چھوٹ جائینگے لیکن ھمارے شعراء کو جہنم میں جھونک دیا جائیگا۔ حالی نے کسی خاص شاعر کو چن کر ھدف ملامت نہیں بنایا تھا ۔ اس کی تنقید زیادہ تر عام تھی ۔ لیکن اقبال نے جوش اصلاح میں حافظ پر شدید حملہ کر دیا کہ اس کا کلام مسلمانوں کے لئے افیون کا کام کرتا ھے ۔

مار گلزارے کہ دارد زھر ناب صید را اول ھمی آرد بخواب

مسلمان حافظ کو ولی اللہ اور لسان الغیب سمجھتے ھیں اور قرآن کریم کی طرح حافظ کے دیوان سے فال نکالتے ھیں ۔ اس کی شراب کو شراب معنوی سمجھتے ھیں اور یہ عقیدہ رکھتے ھیں کہ اس کا مجاز حقیقت کا پردہ دار ھے ۔ لیکن مجاز میں حقیقت کی جھلک دیکھنے والے کم ھیں اور عشق کو ھوس بنانے والے زیادہ۔ اگر کوئی لذت پرست شخص حافظ علیہ‌الرحمہ کا کلام پڑھے تو اس کو اپنی لذت پرستی یا جھوٹی مستی کے لئے بہت کچھ جواز مل جائیگا ۔ اقبال کا رویہ دیوان حافظ کے بارے میں اورنگ زیب عالمگیر کے زاویۂ نگاہ کے مشابہ ھے، جس کے متعلق روایت ھے کہ وہ لوگوں کو دیوان حافظ کے پڑھنے سے روکتا تھا ۔ اگر چہ اس روایت کے ساتھ یہ بھی ھے کہ خود اسے اپنے تکئے کے نیچے رکھتا تھا ۔ جب لوگوں کی طرف سے بہت بے دے ھوئی تو اقبال نے حافظ پر جو تنقید کی تھی اس کو دوسرے ایڈیشن سے خارج کر دیا ۔ اقبال کہتا ھے کہ عرب کے کلام میں حقیقت پروری اور ھمت افزائی تھی ۔ اس میں صحرا کی گرمی اور باد صر صر کی تندی تھی۔ عجمی افکار و جذبات نے اسلامی ادب کو زندگی کی قوتوں سے بیگانہ کر دیا ۔ نقد سخن کو ھمیشہ معیار زندگی پر پرکھنے کی ضرورت ھے ۔ جس طرح علم برائے علم ایک لایعنی شغل ھے اسی طرح فن برائے فن بھی نخل حیات کی ایک بریدہ اور افسردہ شاخ ھے ۔

اسلامی ادبیات کی تنقید کے بعد اقبال نے تربیت خودی کے تین مراحل بیان کئے ھیں ۔ پہلا مرحلہ اطاعت ھے جس سے ثابت ھوتا ھے کہ اقبال کی خودی خود سری نہیں ھے ۔ حکمرانی

کے لئے پہلے حکم برداری کی مشق مسلم ہے۔ جس نے خود اطاعت کی مشق نہ کی ہو وہ دوسروں سے اطاعت طلب کرنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔ انسان کو خدا اختیار ورزی کی مشق کرانا چاہتا ہے تا کہ وہ فطرت کے جبر سے نکل کر اپنے اختیار سے فضیلت کوش اور خدا طلب بن سکے۔ اصل مقصد اطاعت کو اختیاری بنانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ سکتے ہیں کہ جبر کو اختیار میں بدلنا ہے۔ ایک عارف کا قول ہے کہ ہمیں اختیار اس لئے عطا کیا گیا ہے کہ ہم اپنے اختیار کو خدا کے اختیار کا ہم کنار کر کے جبرو اختیار کا تضاد محو کر دیں۔ فرماں پذیری کسی غیر کی نہیں بلکہ اپنی فطرت کے نصب‌العین کی ہے۔ اسی مضمون کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار*

جب انسان اپنے اختیار سے اپنی سیرت کو مستحکم کر چکتا ہے تو وہ ایک منظم آئین کے ماتحت عمل کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس میں ایک اختیاری جبر پیدا ہو جاتا ہے۔ باقی تمام کائنات بھی آئین پر قائم ہے۔ لیکن اس میں آئین سے سرگردانی کی کوئی طاقت یا میلان نہیں۔ بقول مرزا غالب

گر چرخ فلک گردی سر بر خط فرماں نہ
ور گوئے زمیں باشی وقف خم چوگاں شو

اسی طرح ضبط نفس سے نفس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

---

*اطاعت کی طریقت میں برابر صبر لازم ہے
جو مختاری کی خواہش ہو تو مشق جبر لازم ہے

خواهشوں کے تھپیڑے کھاتے رھنے سے نفس اور جسم کی قوتیں منتشر ھو جاتی ھیں اور کسی ایک مرکز پر ان کو مرکوز کرنے سے کرنوں میں جو حدت پیدا ھو سکتی ھے نفس اس قوت اور حرارت سے محروم رھتا ھے۔

اقبال کے ھاں خودی کا تصور در حقیقت قرآن کریم کے نیابت الہی کے تصور کا آئینہ ھے۔ خدا کی ذات لامتناھی قوتوں کا سر چشمہ ھے۔ خدا کی مشیت اور قوت کے سامنے خاک و افلاک، ذرہ و خورشید سب سر بسجود ھیں۔ قرآن کریم میں جس نصب‌العینی آدم کا تصور پیش کیا گیا ھے وہ بھی مسجود ملائک ھے، جس طرح خدا خود مسجود ملائک ھے۔ اس ظاھری تضاد سے توحید میں کوئی خلل واقع نہیں ھوتا۔ جب کسی بادشاہ کا وزیر یا نائب پوری طرح سے اس کی سیاست کو سمجھنے والا اور تہ دل سے اس کے احکام کو بجا لانے والا ھو تو اگر چہ سر چشمۂ اقتدار بادشاہ ھے لیکن رعایا کو نائب کی اطاعت اسی طرح کرنی پڑتی ھے جس طرح بادشاہ کی۔ انسان کا نصب‌العین یہ ھے کہ شمس و قمر، شجر و حجر اور کائنات کی وہ قوتیں جنہیں ملائکہ کہتے ھیں، سب کے سب اس کے لئے مسخر ھوں اور یہ اسی طرح ھو سکتا ھے کہ وہ مشیت ایزدی کے عرفان سے اپنی خودی کو استوار کرتا چلا جائے اس کی قوت تسخیر کی کوئی حد نہ ھو گی۔ نباتات، اور حیوانات، اور اجرام فلکیہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ ملائکہ، انبیا اور آخر میں خدا کے ساتھ ھم کنار ھو سکیگا۔ یہی وہ مقام ھے جس کی نسبت اقبال کہتا ھے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ نائب حق ترقی کرتا ہؤا، جزو و کل سے آگاہ ہوتا ہؤا، قائم بامر اللہ ہو جائیگا۔ اس نائب حق یا خلیفۃ اللہ کی فطرت صرف موجودہ عالموں ہی کی تسخیر نہیں کریگی بلکہ وہ خدا کی خلاقی سے بہرہ اندوز ہوکر ہژدہ ہزار جدید عوالم بھی وجود میں لا سکیگا۔ اس کی فطرت لامتناہی ممکنات سے لبریز ہو گی جو نمود کے لئے بیتاب ہونگے۔

فطرتش معمور و می‌خواهد نمود عالمے دیگر بیارد در وجود
صد جہاں مثل جہان جزو و کل روید از کشت خیال او چوگل*

ایک نقاد نے کہا ہے کہ اقبال نے نیابت الہی کے پردے میں انسان کو خدا بنا دیا ہے - اس سلسلے میں اقبال نے جوش میں آ کر ایسے اشعار لکھے ہیں جہاں انسانیت اور الوہیت کے ڈانڈے ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں -

از قم او خیزد اندر گور تن
مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن
ذات او توجیہ ذات عالم است
از جلال او نجات عالم است

---

* وہ اپنی فطرت معمور کا جلوہ دکھاتا ہے
نئی اسکی امنگیں ہیں، نئی دنیا بساتا ہے
جہان جزو و کل خاطر میں کیا لائے کمال اسکا
کھلاتا ہے کئی ایسے جہاں باغ خیال اسکا

جلوه ها خیزد ز نقش پائے او
صد کلیم آوارۂ سینائے او*

ایسے اشعار سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں ایسے اشارے موجود ھیں کہ عبودیت میں کامل ھوکر اور خدا کی ذات کو اپنی ذات میں سمو کر بندہ جو فعل کرتا ھے اس کے اس فعل میں اور خدا کے فعل میں کوئی فرق نہیں رھتا۔ 'مارمیت' کی آیت کے علاوہ بھی اور کئی آیات اس نظریہ کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ھیں۔ اس کے علاوہ قدیم اسلامی تعلیم کے مطابق انسان کا فرض یہ ھے کہ وہ اخلاق الہیہ اپنے اندر پیدا کرنے کی سعئی بلیغ کرے۔ اخلاق الہیہ، صفات الہیہ ھی ھیں اور صفات کو ذات سے جدا نہیں کر سکتے۔ اس مسئلے کو اقبال کے مرشد رومی نے ایک تشبیہ سے واضح کرنے کی کوشش کی ھے۔ مولانا فرماتے ھیں کہ لوھا آگ میں پڑکر آگ کا ھم شکل اور بہت حد تک اس کا ھم صفت ھو جاتا ھے۔ بہت سے کام جو آگ کر سکتی ھے، وہ ایسی حالت میں لوھا بھی کر سکتا ھے۔ لوھا ایسی حالت میں اگر 'من آتشم' کہ اٹھے تو غلط نہ ھوگا۔ اگرچہ اس ھم صفتی کے باوجود خدا اور 'تخلقو با خلاق اللہ' پر کاملاً عمل کرنے والے بندے میں

---

*وہ قم کہدے تو گور تن میں مردہ جان جی اٹھے
صنوبر' جیسے بن کر باغ میں نیلم پری اٹھے
ھوئی تخلیق عالم کی کہ ھستی اسکی کامل ھو
ضمانت ھے جلال اسکا نجات عالم کو حاصل ھو
فراوانی ھے جلووں کی جہاں ھے نقش پا اس کا
طلب میں اسکے سینا کے ھیں آوارہ کئی موسیٰ

پھر بھی خالق و مخلوق کا ذاتی امتیاز باقی رھیگا ۔ یہ نائب حق کسی بنے بنائے عالم کے ساتھ توافق کی کوشش ھی میں نہیں لگا رھتا ۔ وہ شکوۂ فلک میں آہ و زاری نہیں کرتا رھتا ۔ بلکہ زمین و آسمان کو متزلزل کر کے ' فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم ' کے لئے ھی آمادہ ھوتا ھے ۔

گر نہ سازد با مزاج او جہاں می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیاد موجودات را می دھد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را بر ھم زند چرخ نیلی فام را بر ھم زند*

مغرب میں اقبال کے شباب سے کسی قدر پیشتر نطشے نے بڑے زور شور سے فوق‌البشر کا تخیل نیم شاعرانہ نیم حکیمانہ اور کسی قدر مجذوبانہ انداز میں پیش کیا تھا جس کا لب لباب یہ ھے کہ موجودہ نوع انسان ایک بہت گئی گذری مخلوق ھے ۔ عجز و انکسار کی مذھبی اور اخلاقی تعلیم نے اس کے اقدار حیات کو پاٹ کر انسان کو راضی بہ تذلل اور مائل بہ انحطاط کر دیا ھے ۔ فعلیت کی بجائے انفعال کو سراھا جاتا ھے ۔ تنازع للبقا میں حیوانی انواع محض افزائش قوت کے اصول پر عمل کرتی ھوئی امیبا (amoeba) سے انسان تک ترقی کر چکی ھیں ۔ زندگی

---

* زمانہ گر نہیں ھوتا موافق اسکی فطرت سے
فلک سے جنگ کا اعلان کرتا ھے وہ ھمت سے
ھلا دیتا ھے بنیادیں وہ موجودات کی آخر
نئی صورت بنا لیتا ھے وہ ذرات کی آخر
وہ کرتا ھے نظام گردش ایام کو برھم
وہ کرتا ھے مدار چرخ نیلی فام کو برھم

سرا سر ایک پیکار ھے۔ قوت زندگی کی ایک اساسی قدر ھے۔ ضعیف پروری سے زندگی کے عناصر سست پڑ جاتے ھیں۔ رحم کوئی فضیلت نہیں بلکہ حیات کش ھونے کی وجہ سے ایک مذموم صفت ھے جو کمزوروں کی اخلاقیات نے اپنی حفاظت کے لئے ایجاد کی ھے۔ رحمن و رحیم خدا بھی بے کار ھے اور رحیم انسان بھی غلامانہ ذھنیت رکھتا ھے۔ موجودہ نوع انسان کو چاھئے کہ اپنے آپ کو منسوخ کرکے ایک نئی نوع کے خواص پیدا کرے۔ زندگی کو فوق البشر انسان کا انتظار ھے جس کی اخلاقیات موجودہ اخلاقیات سے بالکل بر عکس ھوگی۔ وہ تمام اقدار حیات کی نئی تقدیر کریگا اور اپنی قوتوں میں اضافہ کرنے میں وہ تیغ بے دریغ ھوگا۔ وہ زندگی سے فرار نہیں کریگا بلکہ اس کا مقابلہ کرکے اپنے ممکنات کو معرض شہود میں لائیگا۔ وہ سخت کوش ھوگا، مشکل پسند ھوگا اور خطرات سے غذا حاصل کریگا۔ نطشے خدا کا منکر تھا اور تمسخر سے کہتا تھا کہ لوگوں کو ابھی تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ خدا مر چکا ھے۔ اس کے ھاں نفس یا روح کا تصور بھی اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مادی یا جسمانی یا حیوانی قوتوں کا مظہر ھے۔ حقیقت میں اس کو شکایت یہ تھی کہ انسان اچھا حیوان نہیں رھا۔ اچھا حیوان ھو تو شیر کی طرح ھو جس کے دین میں قوت کے سوا اور کوئی آئین نہیں۔ عجز و انکسار کی تعلیم بکروں کی ایجاد ھے تاکہ شیروں کے دانت خالص گیاہ خوری کرے کرتے اپنی تیزی کھو بیٹھیں اور کمزور حیوانوں کو اس طرح شیروں کے جور و تظلم سے نجات مل جائے۔

اسرار خودی لکھنے کے زمانے میں اقبال نطشے کے افکار کے ایک پہلو کا مداح تھا۔ ضعف پسندی اور نفئی خودی کا اقبال بھی مخالف تھا اور نطشے بھی ۔ تہذیب فرنگی کا نطشے بھی ایسا ھی مخالف تھا جیسا کہ اقبال ۔ انحطاط اور پستی اور ضعف خودی کے متعلق اقبال اور نطشے کی زبان بہت ملتی جلتی ھے اور اسرار خودی میں بعض افکار اور بعض مثالیں نطشے سے ماخوذ ھیں۔ لیکن دوسرے لحاظ سے اقبال اور نطشے میں بعدالمشرقین ھے۔ دونوں میں افکار کے ایک پہلو کی ظاھری مناسبت ھے۔ یہ سرسری اور ظاھری مناسبت تو منصورحلاج اور فرعون میں بھی پائی جاتی ھے۔ منصور نے بھی انالحق کہا اور فرعون نے بھی انالحق کہا۔ لیکن دونوں کا انا بھی الگ تھا اور دونوں کا حق کا تصور بھی الگ ۔ ویسے تو مولانا روم اور نطشے کے افکار میں بھی ظاھری مماثلت مل سکتی ھے۔ مولانا بھی آرزو مند ھیں کہ موجودہ انسان اپنی موجودہ مادہ پسندی اور حیوانیت سے اوپر اٹھ جائے اور ایک نئی مخلوق بن جائے۔ مولانا کی ایک طویل غزل میں سے اقبال نے تین اشعار اس تصور کے منتخب کر کے ان کو مثنوی کا فاتحۃالکتاب بنایا ھے ۔ الفاظ کا ظاھر ایسا ھے کہ نطشے بھی سنتا تو پھڑک اٹھتا اور کہنے لگتا کہ میں بھی تو یہی چاھتا ھوں ۔

دی شیخ با چراغ ھمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ھمرھان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا ؤ رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

الفاظ کی ہم آہنگی کے باوجود رومی اور نطشے میں خاک و افلاک کا فرق ہے ایک انسان کو الوہیت کا دامن چھونے کے لئے افلاک پر پہنچانا چاہتا ہے اور دوسرے کے ہاں خاک کے سوا خاک نہیں ۔ اقبال کو نطشے میں یہ بات پسند تھی کہ اس سست عناصر انسان کی خودی کو مضبوط کرنا چاہئے ۔ لیکن نطشے کے ہاں خودی کا تصور ہی محدود اور مہمل تھا ۔ نطشے قوت اس لئے چاہتا ہے کہ ایک اعلیٰ تر نوع حیوان وجود میں آ سکے ۔ رومی اور اقبال قوت تسخیر اس لئے چاہتے ہیں کہ انسان کی خودی مضبوط ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائے کہ اس میں الٰہی صفات کی شان جھلکنے لگے ۔ اقبال اور رومی عالمگیر عشق کی طرف انسانی خودی کو گام زن کرنے کے آرزومند ہیں ۔ جلال الدین رومی بھی جلالی ہیں اور اقبال بھی جلالی ۔ لیکن ان کے ہاں جلال جمال سے ہم آغوش ہے ۔ نطشے بھی قاہری کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس کی قاہری میں دلبری نہیں ۔ مومن کا یہ حال ہے کہ

طبع مسلم از محبت قاہر است مسلم ار عاشق نباشد کافر است
در رضا ئش مرضئی حق گم شود ایں سخن کے باور مردم شود*

---

* جہاں میں طبع مسلم عشق سے بے باک و قاہر ہے
مسلماں گر نہیں عاشق تو وہ زندیق و کافر ہے
رضائے حق ہو گم جس میں وہ ہوتی ہے رضا اُسکی ۔
یقیں اہل جہاں کیسے کریں، ہے بات ہی ایسی

اسرار خودی میں اقبال نے وقت یا ماہیت زمان کے مسئلے کو بہت اہمیت دی ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ ایک معرکۃالآرا موضوع بحث رہا ہے۔ عامۃالناس اور عام دیندار لوگ اس کو کوئی دینی مسئلہ نہیں سمجھتے۔ لیکن حکمت پسند لوگ اس میں حیران اور سر گردان رہتے ہیں کہ وقت کیا چیز ہے۔ وقت کو کوئی چیز بھی کہ سکتے ہیں یا نہیں۔ دنیا میں یا تو اشیاء واشخاص ہیں اور یا افعال و حوادث۔ وقت نہ کوئی شے ہے، نہ کوئی شخص، نہ کوئی فعل اور نہ کوئی حادثہ۔ سب کچھ وقت میں واقع ہوتا ہے لیکن وقت خود کوئی واقعہ نہیں۔ فلسفیوں کی زبان میں یوں کہئے کہ یہ نہ تو جوہر ہے اور نہ عرض۔ ہر قسم کا وجود جن صفات سے متصف ہو کر وجود بنتا ہے ان میں سے کوئی صفت وقت میں نہیں پائی جاتی۔ کیا وقت ازلی اور ابدی ہے یا یہ بھی کسی وقت خلق ہؤا۔ اگر یہ خود مخلوق ہے تو اس کے خلق ہونے سے قبل بھی تو آخر کوئی زمانہ تھا اور اگر زمانہ تھا تو وہ بھی وقت تھا۔ قرآن کریم کے ظاہری الفاظ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے چھ ایام میں زمین و آسمان کو خلق کیا۔ لیکن ہمارے ذہن میں شب و روز اور ایام کا جو تصور ہے وہ تو گردش ارض و مہر و ماہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اجرام فلکیہ کے خلق ہونے اور ان کی گردشیں مقرر ہونے سے قبل ایام کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے۔ اقبال مرد مومن بھی تھا اور مرد حکیم بھی۔ یہ نا ممکن تھا کہ ایسا اہم مسئلہ اس کے دماغ میں گردش نہ کرتا رہے اور وہ اس کا حل تلاش کرنے کے لئے مضطرب نہ ہو۔ اپنے انگریزی خطبات میں بھی اقبال نے

مسئلۂ زمان کو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کو مسلمانوں اور انسانوں کے لئے موت و حیات کا سوال قرار دیا ہے۔ یہ مسئلہ اتنا لطیف اور پیچیدہ ہے کہ اس مختصر سے مقدمے میں اس کے چند اہم پہلوؤں کو واضح کرنا بھی نا ممکن ہے۔ کانٹ جیسے حکیم کبیر نے کہا کہ زمان و مکان دونوں فہم انسانی کے سانچے ڈھانچے ہیں۔ یہ دو رنگی عینک لگا کر انسان کا فہم آفاق کے مظاہر کو علائق و روابط میں منسلک کرتا ہے۔ زمان و مکان دونوں کا وجود نفسی اور اعتباری ہے۔ ماہیت ہستی میں نہ زمان ہے نہ مکان۔ بالفاظ اقبال: نہ ہے زماں نہ مکاں، لاالہ الااللہ! اقبال کا خیال بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ چنانچہ پیام مشرق کے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں کہ

جہان ما کہ پایانے نہ دارد
چو ماہی در یم ایام غرق است

یہ ہماری نا پیدا کنار دنیا، یہ لا متناہی عالم، مچھلی کی طرح وقت کے سمندر میں تیر رہی ہے۔ لیکن یہ وقت کا سمندر ہمارے نفس سے خارج کوئی مستقل حقیقت نہیں بلکہ اس کی یہ کیفیت ہے کہ 'یم ایام در یک جام غرق است'۔ وقت کا یہ دریائے بے پایاں نفس کے کوزے میں سمایا ہؤا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اقبال وقت کے مسئلے کو ایسا اہم کیوں سمجھتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ زمان کو ماہیت وجود اور عین خودی سمجھتا ہے۔ لیکن یہ زمان شب و روز کا زمان نہیں بلکہ تخلیقی ارتقا کا نام ہے۔ یہ نظریۂ زمان وہی

ھے جسے برگساں* نے بڑے دلنشیں انداز میں اپنے نظریۂ حیات کا اھم جزو بنایا ۔ اقبال خود اس نتیجے پر پہنچا تھا ۔ علامہ نے اپنے بعض علم دوست احباب سے بیان کیا کہ برگساں کا مطالعہ کرنے سے قبل میں حقیقت زمان کے متعلق آزادانہ طور پر یہ تصور قائم کر چکا تھا اور انگلستان میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں میں نے اس پر ایک مختصر سا مضمون بھی لکھا جس کو میرے پروفیسر نے کچھ قابل اعتنا نہ سمجھا کیونکہ بات بہت انوکھی تھی۔ برگساں کے زور فکر اور قوت استدلال نے اس میں بہت وسعت اور گہرائی پیدا کردی ۔ لیکن اقبال کے کلام کو پڑھکر معلوم ھوتا ھے کہ اقبال اس مسئلے میں برگساں سے کچھ کم نہیں ۔ اقبال برگساں کا بڑا مداح تھا اور اس کے فلسفے سے اقبال نے فیض بھی حاصل کیا ۔

اس سے اقبال کے کمال پر کوئی دھبا نہیں لگتا ۔ ایسا بارھا ھؤا ھے کہ بڑے بڑے سائنٹیفک نظریات ، فنی ایجادات اور حکیمانہ افکار ایک ھی زمانے میں ایک سے زیادہ اشخاص کی طبیعتوں میں سے ابھرے ۔ اس کے بعد مؤرخ اس بات پر جھگڑتے رھتے ھیں کہ اولیت کا سہرا کس کے سر ھے ۔ کون موجد ھے اور کون نقال ! لیکن اقبال اور برگساں یا اقبال اور نطشے کے متعلق یہ بحث بے کار ھے ۔

---

* برگساں اور اقبال کے نظریات میں ایک اھم فرق یہ ھے کہ برگساں کے ھاں زمان خالص ایک بے مقصد و بے غایت رو کی حثیت رکھتا ھے ۔ اقبال مقصدیت کے شدت سے قائل ھیں ۔ (مترجم)

شعر میں گہرا اور پیچیدہ فلسفیانہ استدلال تو نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہو تو شاعری محض منظوم منطق بن کر رہ جائے اور اپنے فطری تأثر کو کھو بیٹھے۔ اس لئے 'الوقت سیف' کا عنوان قائم کرکے اقبال نے اپنے تصور کے بعض اسا سی خطوط کھینچ دئے ھیں۔ انکی تشریح و تعبیر، سمجھنے والوں اور شارحوں کے لئے چھوڑ دی ھے۔ یہ عنوان اقبال نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول سے حاصل کیا ھے۔ اس کے تحت میں اقبال نے جو اشعار لکھے ھیں ان کا لب لباب یہ ھے کہ زمان یا دھر کوئی مجرد یا ساکن حقیقت نہیں بلکہ ایک تخلیقی حرکت ھے۔ ایک حدیث قدسی ھے: 'لاتسبوالدھر فانی اناالدھر'۔ اللہ تعالے فرماتا ھے کہ زمانے کو گالیاں نہ دو کیونکہ میں زمانہ ھوں۔ علامہ اقبال فرماتے تھے کہ گول میز کانفرنس کے سفر کے دوران میں میں برگساں سے ملا کہ اپنے اس ھم فکر اور ھم طبع مفکر سے تبادلۂ خیالات کروں۔ دوران ملاقات میں حقیقت زمان پر گفتگو ھوئی جو اقبال اور برگساں کا واحد مضمون تھا۔ اقبال کہتے ھیں کہ میں نے برگساں کو بتایا کہ محمد رسول اللہ صلعم نے دھر کے متعلق یہ فرمایا ھے۔ فرماتے تھے کہ برگساں سن کر اچھل پڑا اور اس کی روح بے انتہا مسرت سے لبریز ھو گئی کہ ایک نبی عظیم کے قلب پر وھی حقیقت وارد ھوئی جسے وہ استدلال اور ذاتی وجدان کی بنا پر دنیا کے سامنے عمر بھر پیش کرتا رھا۔ غرضیکہ اس نظریہ کے مطابق دھر خلاق ایک شمشیر ھے جو خود اپنا راستہ کاٹتی ھوئی اور مزاحمتوں کو راستے سے ھٹاتی ھوئی چلی جاتی ھے۔ دھر کی یہ ارتقائی اور خلاق قوت کبھی

کلیم کے اندر کار فرما ہوتی ہے اور کبھی حیدر کرار کے پنجۂ خیبر گیر میں ۔ اس زمان حقیقی میں دوش و فردا نہیں ہیں ، نہ انقلاب روز و شب ہے ۔ لوگوں نے زمان کو مکان پر قیاس کر لیا ہےاور یوں سمجھ لیا ہے کہ ایک لا متناہی لکیر ہے جو ازل سے ابد تک کھنچی ہوئی ہے ۔ نافہم انسان وقت کو لیل و نہار کے پیمانوں سے ناپتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خدا کا وقت ہمارا وقت نہیں ۔ اسی طرح خودی میں ڈوب کر زندگی سے آگاہ ہونے اور زندگی کی قوتوں کو وسعت دینے والے انسان کا وقت بھی ماضی ، حال اور مستقبل میں تقسیم شدہ کوئی مکانی انداز کی چیز نہیں ۔ خودی کی ماہیت حیات جاوداں ہے ۔

تو کہ از اصل زماں آگہ نۂ
از حیات جاوداں آگہ نۂ*

زندگی وقت میں نہیں گزرتی بلکہ وقت زندگی کی تخلیقی قوت ہے ۔ گردش خورشید سے پیدا ہونے والا وقت مکانی اور مادی وقت ہے ۔ حقیقی وقت کا اس سے کچھ تعلق نہیں ۔ لیل و نہار کا شکار غلام ہوتا ہے ۔ زندگی جب مردہ ہو جاتی ہے تو وہ لیل و نہار کا کفن پہن لیتی ہے ۔ اور انسان افسوس کرتا ہے کہ عمر گرانمایہ کے اتنے ایام گزر گئے اور اب گردش ایام مجھے موت کے قریب لے جا رہی ہے ۔

اقبال مسئلۂ زمان کو اس لئے اہمیت دیتا ہے کہ اس کے ہاں عبد اور حر کی تمیز کا معیار بھی یہی ہے کہ کوئی روح

---

* نہیں اے بے خبر اصل زماں سے آگہی تجھکو
ہو کیسے پھر حیات جاوداں سے آگہی تجھکو

ایام کی زنجیر سے پا بجولاں ہے یا مکانی وقت سے آزاد ہو کر اور حقیقی زمان میں غوطہ لگا کر تسخیر مسلسل اور خلاقی کا شغل رکھتی ہے ۔ اقبال کا خیال ہے کہ ازل سے ابد تک بنی بنائی تقدیر کا تصور بھی زمان کے غلط تصور کی پیداوار ہے ۔

عبد را ایام زنجیر است و بس
بر لب او حرف تقدیر است و بس
همت حر با قضا گردد مشیر
حادثات از دست او صورت پذیر

جس انسان کے ہاتھ میں زمانے کی تلوار ہو وہی زندگی کے ممکنات کو نمایاں کر سکتا ہے ۔ زمانے کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک اس کا باطن ہے ۔ زمانے کی ظاہری صورت سے موافقت پیدا کرنے والا پست همت زمانہ ساز ہوتا ہے ۔ مرد حر زمانہ ساز نہیں ہوتا بلکہ زمانے کے ساتھ ستیز کے لئے آمادہ ہوتا ہے اور اس پیکار میں اس کو کامیابی اسی حالت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ حقیقت زمان کی شمشیر اس کے ہاتھ میں ہو ۔

یاد ایامیکه سیف روزگار با توانا دستئی ما بود یار†

---

* زمانہ عبد کے دل کو کڑی زنجیر ہوتا ہے
ہمیشہ اسکے لب پر شکوۂ تقدیر ہوتا ہے
اشارہ حر کی همت کا قضا کا رخ بدلتا ہے
جو ہونا ہے وہ اُسکے ہاتھ کے سانچے میں ڈھلتا ہے

† کبھی وہ دن تھے، اپنے دست و بازو میں بھی طاقت تھی
ہمارے ہاتھ اور سیف زمانہ میں رفاقت تھی

مثنوی اسرار خودی جواہرالحکم سے لبریز ہے ۔ ایک ایک نکتے کی تشریح کے لئے ایک ایک مقالہ درکار ہے ۔ بزم اقبال نے یہ اہم کام اپنے ذمے لیا ہے ور کچھ اہل فکر کو تحقیق پر آمادہ کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے ۔ فارسی کا چرچا ملک میں کم ہو رہا ہے ۔ اردو دان بہت ہیں اور فارسی دان خال خال ۔ اس بات کی اہم ضرورت ہے کہ اقبال کے فارسی کلام کو، جو اس کی حکمت اور لطیف افکار سے لبریز ہے ، اردو کا جامہ پہنایا جائے ۔ ترجمے میں اصل والی بات کبھی نہیں آسکتی خواہ جسٹس رحمان جیسا ذہین و فطین اور نظم و نثر پر قادر اہل قلم ہی ایسی ہمت کرے ۔ کسی شخص نے ترجمے کے متعلق خوب کہا ہے کہ یہ گلکاری پردے کی الٹی طرف ہوتی ہے ۔ پھر بھی گل بوٹوں کا کچھ نقشہ الٹی طرف سے بھی دکھائی دیتا ہے اور نقشے کا اندازہ ہو جاتا ہے البتہ سیدھی طرف وا لی بات اس میں نہیں آتی ۔ لیکن بعض کشمیری دستکار شالوں پر دو رخا کام کرتے ہیں پھر گلکاری کے لحاظ سے یہ ہوتا ہے کہ

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا ۔

رحمان صاحب نے ترجمہ بڑی محنت، بڑی دیانت اور بڑی فن کاری سے کیا ہے ۔ اصل کو بر طرف کر کے اپنی شاعری کی داد لینے کی کوشش نہیں کی ۔ جا بجا شعر یا مصرعے برجستہ ایسے نکل آئے ہیں کہ اصل کا لطف آجا تا ہے ۔ اگر اس کامیاب کو شش کے بعد وہ رموز بیخودی اور رفتہ رفتہ تمام فارسی کلام پر اسی قسم کی مساعی صرف کریں تو اقبال کے حکیمانہ اور حیات انگیز افکار کو عام کرنے میں بڑی مدد ملے ۔ عدالت عالیہ

کا دھندا ، یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا، کھڑاگ اور خدا جانے کیا کیا مشاغل ان کی ہمت اور ان کے وقت پر ڈاکا ڈالتے ہیں ۔ ان سب مصروفیتوں کے باوجود ایسے لطیف ادبی کام کے لئے وقت نکالنا اور طبیعت کو آمادہ کرنا بے حد قابل تحسین ہے ۔ ہماری تو خواہش ہے کہ ان کے اور مشاغل کم ہو جائیں جو اور لوگ بھی کم و بیش خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور ادبی مشاغل کے لئے ان کی فرصت میں اضافہ ہو جائے۔ فطرت نے ان کو قاضی نہیں بلکہ ادیب بنایا تھا ۔ خدا کرے کہ وہ قضا سے زیادہ ادب کی طرف توجہ کر سکیں ۔

اسرارِ خودی

تمہید

متاع شب کو لوٹا جس گھڑی سورج کی کرنوں نے
دئے چھینٹے رخ گل پر چمن میں میرے اشکوں نے

جگایا چشم نرگس کو مری آنکھوں نے رو رو کر
اگا سبزہ مری آواز سے بیدار ہو ہو کر

مرے زور سخن کی باغباں نے آزمائش کی
جہاں مصرع مرا بویا وہاں شمشیر اگ آئی

چمن میں بیج بویا اس نے بس میرے ہی اشکوں کا
سمویا باغ کے بانے میں تانا میرے نالوں کا

میں ذرہ ہوں مگر قبضے میں میرے مہر رخشاں ہے
چھپائے صد سحر آغوش میں میرا گریباں ہے

کہیں روشن ہے جام جم سے میری خاک کی مٹھی
نہیں جن کا وجود ابتک، یہ رکھتی ہے خبر اُن کی

اُس آہو کو مرا فکر رسا لایا اسیری میں
قدم رکھا نہیں جس نے ابھی میدان ہستی میں

اُگیگا جو کبھی سبزہ، وہ اب ہے میرے گلشن میں
جسے کھلنا ہے ڈالی پر، وہ گل ہے میرے دامن میں

سرود و نغمہ کی محفل کو میں نے کر دیا برہم
تڑپ اٹھا مرے مضراب سے تار رگ عالم

انوکھا ہے نواؤں میں، مری فطرت کا ساز ایسا
نہیں واقف مرے نغموں سے ابتک ہم نشیں میرا

نیا خورشید بنکر دہر میں ظاہر ہؤا ہوں میں
فلک کے رسم و آئیں سے ابھی نا آشنا ہوں میں

نہیں تاروں کو خوف اس سے، نہاں ہے میری تابانی
مجھے سیماب نے آشفتگی اب تک نہیں جانی

Malik Ram

سمندر پر ابھی رقصاں نہیں موج ضیا میری
عروس کوہ کو اب تک نہ ہاتھ آئی حنا میری

نہیں ہے چشم ہستی میری صورت کی ابھی خو گر
مجھے خوف نمود ایسا ہے، لرزہ ہے مرے تن پر

ہوئی شب ختم، مشرق سے مری روشن سحر آئی
نئی شبنم گل عالم کے رخ پر اس نے ٹپکائی

نہ رکھیں منتظر مجھ کو سویرے جاگنے والے
مبارک ہیں مری لو کو مقدس ماننے والے

میں نغمہ ہوں مجھے مضراب کی ہر گز نہیں پروا
کہ میں ہوں اس زمانے میں نوائے شاعر فردا

نظر سے عہد حاضر کی رہے اسرار حق پنہاں
یہ وہ بازار ہے جو میر ے یوسف کے نہیں شایاں

پرانے دوستوں میں ہم نے اہل اسکے نہیں پائے
ہے میرا طور سوزاں منتظر، کوئی کلیم آئے

سمندر دوستوں کا پر سکوں مانند شبنم ہے
مری شبنم مثال بحر طوفانوں کی ہمدم ہے

نرالا ھے مرا نغمہ، نیا اسکا جہاں ھوگا
یہ وہ بانگ درا ھے جس کا اپنا کارواں ھو گا

ھوئے ایسے بہت شاعر جو مر کر پھر ھوئے پیدا
ھوئیں بند اُن کی آنکھیں، ھم کو لیکن کر گئے بینا

نکل آئے عدم سے ساتھ لیکر ناز کا ساماں
اُبھر آئے لحد کی خاک سے مثل گل خنداں

ھزاروں قافلوں کی گرد سے واقف ھے یہ صحرا
مثال پائے ناقہ وہ مگر گزرے ھیں بے غوغا

میں عاشق ھوں، سدا فریاد کرنا میرا ایماں ھے
جلو داری پہ میری شور محشر آپ نازاں ھے

مرا نغمہ ھے میرے تار کے اندازہ سے بڑھکر
مجھے لیکن نہیں ھے ساز کے کچھ ٹوٹنے کا ڈر

مرے سیلاب سے قطرہ رہے بیگانہ اچھا ھے
اثر سے اسکے قلزم ھی بنے دیوانہ اچھا ھے

نہیں ممکن سمائے میرا طوفاں ندی نالوں میں
یہ وسعت چاھتا ھے جو ملیگی اسکو بحروں میں

وہ غنچہ جو نہ گلشن ہوسکا، خود پھول کے بڑھ کے
نہیں شایاں کہ آسپر میرے ساون کی گھٹا برسے

بہت ہیں بجلیاں خوابیدہ میری روح کے اندر
تڑپتا ہوں تو چھا جاتا ہوں میں ہر کوہ و صحرا پر

مرے قلزم سے دو دو ہاتھ کر لے گر تو صحرا ہے
مرے شعلوں کو سینے سے لگا لے گر تو سینا ہے

ازل سے چشمۂ حیواں مرے حصے میں آیا ہے
مجھے فطرت نے محرم راز ہستی کا بنایا ہے

مرے سوز نوا کے فیض سے ذرہ ہؤا زندہ
تڑپ کر، جگمگا کر، بن گیا وہ مہر تابندہ *

میں تجھ سے راز وہ کہتا ہوں جو تھے ان کہے ابتک
میں وہ موتی پروتا ہوں جو ناسفتہ رہے ابتک

اگر خواہش ہو عیش جاوداں کی، پاس میرے آ
جو چاہے تو زمیں بھی آسماں بھی، پاس میرے آ

---

* اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو شاید یوں بہتر ہو
کئے پر اُس نے پیدا، بن گیا وہ کرم تابندہ

کئے پیر فلک نے مجھ پہ کیا کیا راز ہیں افشا
ندیموں سے نہیں ممکن مگر اسرار کا اخفا

اٹھ اے ساقی شراب ناب سے لبریز کر ساغر
مٹادے کاوش ایام دل سے، ایسا بھر ساغر

مجھے دے آتش سیال جسکی اصل زمزم ہے
گدا بھی ہو پرستار اسکا، پھر بھی شاہ عالم ہے

وہ جس سے قوت فکر اور بھی ہشیار ہوتی ہے
وہ جس سے چشم بیدار اور بھی بیدار ہوتی ہے

وہ جس سے اعتبار کوہ ملتا ہے پر کہ کو
عطا کرتی ہے جو شیروں کی قوت ایک روبہ کو

ثریا کی بلندی خاک کے ذرے کو دیتی ہے
سمندر کی جو وسعت آب کے قطرے کو دیتی ہے

جو خاموشی کو شور حشر کی تمثال کرتی ہے
جو پائے کبک کو بازوں کے خوں سے لال کرتی ہے

مرے ساقی مجھے دے اس شراب ناب کا ساغر
جو برسا دے قمر کا نور میرے فکر کی شب پر

که منزل کی طرف لاؤں میں پھر بھولے ہوئے راہی
تمنا ہے کہ نظارہ کو دوں میں ذوق بے تابی

قدم خود شوق سے اٹھے، نئی ہو جستجو میری
نیا مقصود ہو میرا، نئی ہو آرزو میری

میں اہل ذوق کی آنکھوں کا تارا بن کے اتراؤں
صدائے راز بنکر گوش عالم میں سما جاؤں

کروں جنس سخن کے نرخ بڑھ جانے کا میں ساماں
اثاثہ میں ملا دوں اپنے اشکوں کے در تاباں

ملا ہے فیض روسی سے بصیرت کا مجھے حصہ
میں پھر پڑھ لوں کتاب علم کے سب راز سر بستہ

بھڑکتے شعلوں کی دولت سے جاں ہے مالا مال آسکی
مگر مثل شرر ہے ایک لحظہ روشنی میری

مرے پروانہ پر خود شمع سوزاں نے کیا حملہ
مرے پیمانہ پر بادہ نے مارا آکے خود چھاپہ

مری مٹی کو پیر روم نے اکسیر کر ڈالا
مری خاک پریشاں سے کئی جلوے کئے پیدا

اٹھا، کر کے تہیہ، خاک کا ذرہ بیابان سے
کہ موج نور ہاتھ آئے اُسے خورشید تاباں سے

میں ہوں موج رواں اور بحر روسی ہے مری منزل
تمنا ہے در مقصود ہو جائے مجھے حاصل

اُسی کی سے میں میری مستیوں کا راز ہے مخفی
اُسی کی گرم سانسوں نے ہے مجھکو زندگی بخشی

مرا دردِ آشنا دل رات کو فریاد کرتا تھا
دعاؤں سے میں دشتِ خامشی آباد کرتا تھا

مرے لب پر غم و رنج زمانہ کی حکایت تھی
میرا پیمانہ کیوں خالی ہے، یہ میری شکایت تھی

میں نطارے کی بے تابی سے عاجز ہو گیا آخر
تھکن سے چور چور ایسا ہؤا میں سو گیا آخر

نظر پھر خواب میں مجھکو وہ پیرِ حق سرشت آیا
زبان پہلوی میں جس نے قرآں سر بسر لکھا

کہا تو عشق کا دم بھرنے والوں کا ہے دیوانہ
مئے نابِ محبت کا لگا ہونٹوں سے پیمانہ

جگر اپنے کو تو ہنگامۂ محشر سے ٹکرا دے
تو سر کو شیشہ سے اور آنکھ کو نشتر سے ٹکرا دے

ہوں ایسے قہقہے، نالوں کا جو سرمایہ بن جائیں
ہوں ایسے اشک خونیں جو جگر کی آگ بھڑکائیں

رہیگا وقف خاموشی تو کب تک غنچہ کی صورت
شگفتہ پھول کی مانند ہو ارزاں تری نکہت

ترا ہنگامہ ہے مثل سپند اک راز سر بستہ
بنالے اپنا محمل تو دھکتا سرخ انگارہ

جرس کی طرح تیرے جسم کا ہر ذرہ تھرائے
جگا کر خفتہ فریادیں، سراپا نالہ بن جائے

تو آتش ہے، بھڑک کر جگمگا دے محفل دنیا
جہاں والوں میں کردے عام تو سوز و گداز اپنا

بیاں کر راز پیر میکدہ کے بے دھڑک ہو کر
تو بن کر موج مے مینا کے پردے میں ہو جلوہ گر

مثال سنگ ہو جا تو، اگر ہے فکر آئینہ
پٹخ کر ٹکرے ٹکرے کر سر بازار یہ شیشہ

نیستاں کا پیامی بن کے تو نے کی صدا ہو جا
تو قیس دشت پیما کو سنا پیغام لیلیٰ کا

نیا انداز نالہ کا تجھے ایجاد کرنا ہے
نرالی ہاؤ ہو سے بزم کو آباد کرنا ہے

اٹھ اور اک جان نو ہر جینے والے کو عطا کر دے
تو جوش زندگی زندوں میں قم کہکر سوا کر دے

کمر باندھ، اٹھ، نئے اک راستے پر آکے راہی ہو
دماغ و دل سے کر دے دور تو سودائے کہنہ کو

ہو واقف لذت گفتار سے، کر ترک خاموشی
درائے کارواں اب جاگ، کب تک خود فراموشی!

مرے تن من میں ان باتوں سے شعلہ سا لپک اٹھا
مثال نے مرے سینے میں ہنگامہ ہؤا پیدا

نوا کیطرح آبھرا میں نکلکر اپنے تاروں سے
بہشت گوش میں نے کر دیا تعمیر نغموں سے

خودی کے چہرہ سے میں نے ہٹایا راز کا پردہ
بتایا میں نے اعجاز خودی کے بھید کا نکتہ

مری ہستی کا نقش اک نقش خام و بے حقیقت تھا
یہ ناکارہ تھا، بے مصرف تھا اور بے قدر و قیمت تھا

گداز عشق نے دی تربیت مجھکو، کیا انساں
جہاں کی ہر حقیقت کا مجھے یوں دیدیا عرفاں

نہیں پوشیدہ مجھ سے جنبشیں اعصاب گردوں کی
روانی میں نے دیکھی ہے رگ مہتاب میں خوں کی

رہا راتوں کو میں انساں کی خاطر اشکبار اکثر
ہؤا اسرار ہستی کا ہے پردہ چاک تب جا کر

اس امکاں کے عالم کو بنایا کار گہ میں نے
بقا کے راز تک پائی بڑی مشکل سے رہ میں نے

مثال ماہ گرچہ میں شب دوراں کی زینت ہوں
مگر اہل نظر! میں کیا ہوں؟ خاک پائے ملت ہوں

وہ ملت جسکا شہرہ ہے جہاں کے گوشہ گوشہ میں
دلوں کی شعلہ سامانی ہے جسکے تازہ نغمہ میں

وہ جس نے بوئے ذرے، آفتابوں سے بھری جھولی
بہم ہیں جسکے خرمن میں کئی عطار اور رومی

میں آہ گرم ہوں ، زد میں مری گردوں کی رفعت ہے
دھؤاں ہوں میں مگر آتش سے مجھکو ربط و نسبت ہے

دم پرواز میرا فکر آس رفعت پہ جا پہنچا
قلم میرے نے راز نہ فلک سب کر دئے افشا

کہ قطرہ وسعتیں حاصل کرے ، دریا کا ہمسر ہو
ترقی یوں کرے ذرہ کہ صحرا کے برابر ہو

نہیں شہکار فن شاعری یہ مثنوی ہر گز
نہیں مقصود میرا بت پرستی بتگری ہر گز

میں ہندی ہوں، زبان فارسی سے ہوں میں بیگانہ
میں ماہ نو کی صورت ہوں ، ہے خالی میرا پیمانہ

طلب کر تو نہ انداز بیاں کی خوبیاں مجھ سے
طلب کر تو نہ طرز خوانسار و اصفہاں مجھ سے*

مجھے تسلیم ہے ہندی ہے شیرینی میں جوں شکر
مگر ہے فارسی کا طرز گفتار اس سے شیریں تر

---

*خوانسار و اصفہاں - ایران کے دو مشہور شہر ہیں جنہیں فارسی کے کئی مشہور شعرا سے نسبت ہے .

ہؤا مسحور اسکے جلوہ سے فکر رسا میرا
مرے خامہ کو اسنے شاخ نخل طور کر ڈالا

تخیل میرا عالی ہے، بلندی اسکو بھاتی ہے
مرے فکر رسا کو فارسی ہی راس آتی ہے

نہ کر تو نکتہ چینی ساغر ومینائے سادہ پر
خرد مندی یہی ہے تو نظر رکھ ذوق بادہ پر

اصلِ نظامِ عالم خودی سے ہے

جہاں میں پیکر ہستی خودی کی اک نشانی ہے
جدھر دیکھیں اُدھر راز خودی کی ترجمانی ہے

خودی کے قلب خفتہ میں جو بیداری کا نور آیا
ہویدا ہوگئی تب عالم پندار کی کایا

جہانوں کے جہاں لپٹے پڑے ہیں ذات میں اسکی
وجود اسکا اگر مانیں تو پھر ہے غیر کی ہستی

سمجھنا غیر اپنے آپ کو اسکا قیامت ہے
اسی سے اس نے بویا دھر میں تخم خصومت ہے

یہ اپنے آپ سے کرتی ہے پیکر غیر کا پیدا
کہ بڑھ جائے مزا جنگ و جدل کا اور تھوڑا سا

کبھی پیک فنا بنتی ہے قوت اسکے بازو کی
کہ اندازہ کرے کتنی ہے ہمت اسکے بازو کی

خودی کی خود فریبی، زندگی کا جام پینا ہے
مثال گل وضو خوں سے ہو، تب جینا بھی جینا ہے

مٹا دیتی ہے صد گلشن یہ اک گل کی تمنا میں
روا رکھتی ہے صد شیون یہ اک نغمے کے سودا میں

مزین اک فلک کرتی ہے سو سو چاند یہ لاکر
یہ پھیلاتی ہے سو بحثیں کہ پہنچے حرف مطلب پر

اسی خاطر یہ بن جاتی ہے مسرف اور پتھر دل
کہ طے کرلے جمال معنوی تکمیل کی منزل

غم فرہاد کا ہے عذر حسن دلکش شیریں
صد آ ہوئے ختن کا عذر ہے اک نافۂ مشکیں

همیشه جلتے رهنا قسمت پروانه میں آیا
مگر جلنے کا عذر اس نے ضیائے شمع میں پایا

کئی امروز کے نقشے بناتا هے قلم اس کا
که فردا کی وه اک خندان سحر کا کرلے نظارا

رکھا اس نے صد ابراهیم کو شعلوں کی بستی میں
که روشن هو چراغ مصطفیٰ اک بزم هستی میں

یه بھر لیتی هے کیا کیا روپ سر گرم عمل هو کر
عیاں هے عامل و معمول و اسباب و علل هو کر

یه اٹھتی هے، اٹھاتی هے، چمک کر بھاگ جاتی هے
یه جل کر، جگمگا کر، مار کر، مر کر، دکھاتی هے

سواری وسعت ایام میں هر دم دواں اسکی
فلک کہتے هیں جسکو وه هے گرد کارواں اسکی

پراز گل دامن آفاق گلکاری سے اسکی هے
هے اسکی نیند سے شب، روز بیداری سے اسکی هے

شراروں میں یه اپنی آگ کو تقسیم کرتی هے
خرد کو جز پرستی اسطرح تعلیم کرتی هے

جو آئے خود شکن بن کر تو اجزا اس سے پیدا ہوں
ذرا آشفتہ ہو جائے تو صحرا اس سے پیدا ہوں

کبھی آشفتگی سے یہ اگر بیزار ہوتی ہے
بہم یکجا سمٹ کر صورت کہسار ہوتی ہے

یہ عادت ہے خودی کی اپنے جو ہر کو کرے افشا
ہے اسکی قوتوں کا ذرے ذرے میں چھپا سوتا

یہ ہے خاموش قوت اور بے تاب عمل ہے یہ*
عمل کے واسطے پابند اسباب عمل ہے یہ

خودی کے زور پر قائم جہاں کی زندگانی ہے
بقدر استواری ہی یہاں کی زندگانی ہے

جو کر لیتا ہے اک قطرہ خودی کے لفظ کو ازبر
بنا لیتا ہے اپنی ہستئی نا چیز کو گوہر

خودی کمزور ہے سے کی، نہیں اسکا کوئی پیکر
اسی صورت میں ڈھل جاتی ہے جس میں ڈھال دے ساغر

---

* ڈاکٹر نکلسن کا ترجمہ
Power that is unexpressed and inert,
Chains the faculties which lead to action.
صاحبباع نہیں معلوم ہوتا—

نہیں شک اسمیں ہر پیکر کو اپناتا ہے جام سے
مگر گردش ہمارے ہاتھ سے پاتا ہے جام سے

پہاڑ اپنی خودی چھوڑے تو وہ صحرا کی صورت ہو
جسے دریا کی موجوں کے تھپیڑوں سے شکایت ہو

ہے جب تک موج شکل موج میں دریا کے سینے پر
چڑھی پھرتی ہے دوش بحر کے آبی سفینے پر

سمٹ کر نور نے حلقہ میں، پائی آنکھ کی صورت
تلاش جلوہ میں گھومی، نگہ میں آگئی حرکت

جو پائی سبزہ نے طاقت خودی سے سر بلندی کی
تو ہمت اسکی پھر گلشن کا سینہ چیر کر نکلی

کیا ہے شمع نے مضبوط رشتہ آپ سے اپنا
کہ سیکھا آسنے باہم ذرہ ذرہ جوڑ کر رکھنا

جو آئی خود گدازی پر تو اپنا آپ کھو بیٹھی
وہ اپنے آنسوؤں میں اپنی کشتی خود ڈبو بیٹھی

نگیں گر خود نگر ہوتا، خودی میں پختہ تر ہوتا
تو پھر غیروں کے ہاتھوں یوں نہ زخمی سر بسر ہوتا

غرور اسکا کسی کے نام کے ادنی خزانے پر
ھے نام غیر کے بارگراں سے زخم شانے پر

زمیں ھے اپنی ھستی میں به نسبت چاند کے محکم
قمر ھے اس لئے گرد اُسکے چکر کاٹتا پیہم

زمیں سے بڑھکے محکم ھے جو خورشید فلک پیما
بنا ھے اس لئے سورج زمیں کی آنکھ کا تارا

چنار پر شکوہ کو دیکھتی ھے آنکھ حیرت سے
گراں مایه ھے کہساروں کا دامن اسکی سطوت سے

نظر آتا ھے وہ پہنے ھوئے پیراھن آتش
مگرجب اصل کو دیکھیں‌تو ھے اک دانه گردن کش

خودی پاتی ھے جب قوت، مئے ھستی کی مستی سے
رواں کرتی ھے بحر بیکراں یه جوئے ھستی سے

خودی کی زندگی تخلیقِ مقاصد سے ہے

بقائے زندگانی کے لئے ہے مدعا لازم
ہے اسکے کارواں کو ایک منزل کی درا لازم

وھی زندہ ہے زندوں میں جو پیہم جستجو میں ہے
اصول زندگی پنہاں وجود آرزو میں ہے

کئے جا دل کی تاریکی میں شمع آرزو روشن
کہ تیرا پیکر خاکی نہ بن جائے ترا مد فن

جہان رنگ و بو زندہ تمنا کی بدولت ہے
ازل سے آرزو ہر شے کی فطرت میں امانت ہے

تمنا ھی سے انسانوں کے سینوں میں ہے دل رقصاں
ہیں اسکے نور سے سینے مثال آئنہ رخشاں

اسی سے خاکیوں میں طاقت پرواز آتی ہے
کلیم عقل کویہ خضر بنکر رہ دکھاتی ہے

اسی کے سوز سے دل میں ابھرتی زندگانی ہے
پیام مرگ غیر حق کو دل کی زندگانی ہے

تمنا جب نه پیدا کرسکے، دل دل نہیں رهتا
پر پرواز کهو کر وه کسی قابل نہیں رهتا

خودی کے سارے هنگامے تمنا هے بپا کرتی
خودی دریا، تمنا ایک بیکل موج هے اسکی

مقاصد کی شکاری هے کمند آرزو گویا
تمنا هی سے ربط و ضبط هے افعال میں پیدا

تمنا جب نه هو دل میں تو پهر زنده بهی مرده هے
نه جس میں سوزش باطن هو خاکستر وه شعله هے

یه کس نے دیدۂ انساں کو بیداری سکهائی هے
هماری لذت دیدار نے صورت بنائی هے

ملے کبک دری کو پاؤں ذوق خوشخرامی سے
ملی منقار بلبل کو هے شوق نغمه خوانی سے

نکل کر نیستاں سے نے هوئی آباد عالم میں
جو نغمے قید تهے اسمیں، هوئے آزاد عالم میں

یه نادر شے کی دیوانی، فلک رس عقل انسانی
تجهے معلوم هے کیا هے، یه اعجاز همه دانی

کرم سے آرزو کے لعل در آغوش ہے ہستی
ہے عقل معجزہ فن مادر ہستی کی اک بیٹی

حقیقت کیا ہے نظم قوم کی، آئیں کی، رسموں کی
حقیقت کیا ہے علم و فن کے ہر دم تازہ چہروں کی

تمنا ہے جو ٹکڑے ہوگئی ہے زور مستی سے
بنائی جس نے یہ صورت نکل کر دل کی بستی سے

یہ ہاتھ اپنے، یہ دندان و دماغ و چشم و گوش اپنے
یہ فکر اپنا، یہ تخئیل و شعور و یاد و ہوش اپنے

جو رزم دھر میں دوڑا کے توسن زندگی نکلی
بنائے اس نے یہ آلے ، حفاظت کے لئے اپنی

نہیں ہے آگہی مقصود، علم و فن کی کثرت کا
نہ گل بوٹے ہی مقصد ہیں، چمن بندی کی محنت کا

حصول علم حفظ زندگی کا اک وسیلہ ہے
خودی کی قوتیں بیدار کرنے کا ذریعہ ہے

جنم لیتے ہیں گھر میں زندگی کے علم و فن سارے
حضور زندگی ہیں با ادب خادم یہ بیچارے

اٹھ اے جو زندگی کے راز سے اب تک ہے بیگانہ
نکل رن میں کسی مقصد کی مے سے ہو کے مستانہ

ہو روشن صبح خنداں کی طرح تیرا حسیں مقصد
جو یکسر ماسوا کو پھونکدے وہ آتشیں مقصد

وہ مقصد آسماں جسکی بلندی کی قسم کھائے
جو صاحبدل کے پہلو سے چرا کر دل کو لیجائے

اڑا دے باطل دیرینہ کی جو دھجیاں یکسر
بغل میں جسکے ہنگامے ہوں، جسکے دوش پر محشر

ہے تخلیق مقاصد سے شرار زندگی ہم میں
شعاع آرزو کے فیض سے تابندگی ہم میں

خودی عشق و محبت سے مضبوط ہوتی ہے

وہ نقطہ نور کا جسکو خودی کہتے ہیں دانشور
شرر ہے زندگانی کا ہماری خاک کے اندر

محبت سے یہ کچھ پائندگی میں اور بڑھتی ہے
چمک میں، سوز میں اور زندگی میں اور بڑھتی ہے

چمک اٹھتا ہے جوہر اسکا تاثیر محبت سے
أبھرتی ممکنات اسکی ہیں تنویر محبت سے

بنی ہے عشق سے ہی فطرت اسکی آتش اندوزی
سکھایا عشق نے اسکو طریق عالم افروزی

ڈرا سکتے نہیں ہیں عشق کو تلوار اور خنجر
نہیں مٹی سے، پانی سے، ہوا سے، عشق کا گوہر

جہاں میں صلح بھی ہے عشق اور پیکار بھی ہے یہ
یہ ہے آب بقا اور تیغ جوہر دار بھی ہے یہ

نگاہ عشق کر دیتی ہے ٹکڑے سنگ خارا کو
سراپا حق رہیگا بن کے، عشق حق جو کامل ہو

سبق پڑھ عاشقی کا، ہو کسی محبوب کا طالب
ہو چشم نوح کا طالب، دل ایوب کا طالب

تو اپنی خاک کی مٹھی سے کر لے کیمیا پیدا
کسی کامل کی چوکھٹ چوم کر تو سیکھ لے جینا

مثال پیر رومی آپ اپنی شمع روشن کر
جلا دے آتش تبریز میں سب روم کا دفتر

ھے تیرے دل کی گہرائی میں اک معشوق پوشیدہ
دکھا سکتا ہوں تجھکو میں، جو تو ہو صاحب دیدہ

حسیں تر ھیں حسینوں سے بھی اسکے عشق کے مارے
بہت دلکش، بہت رعنا، بہت بانکے، بہت پیارے

محبت اسکی کرتی ھے عطا دل کو توانائی
زمیں کو یہ بنا دیتی ھے ھمپایہ ثریا کی

کرم سے اسکے خاک نجد میں وہ آگئی چستی
کہ اٹھی وجد میں، افلاک کے آس پار جا پہنچی

حرارت قلب مسلم میں مقام مصطفیٰ سے ھے
ھماری آبرو دنیا میں نام مصطفیٰ سے ھے

ھے طور اک موج ، جو اٹھی غبار خانہ سے اسکے
مقدس اور کعبہ ھو گیا کاشانہ سے اسکے

ابد اوقات میں اسکے ھے اک لمحہ سے بھی کمتر
ابد کو وسعتیں دیتا ھے اسکی ذات کا جوھر

تھا کافی اسکے سونے کیلئے اک ٹاٹ کا ٹکڑا
مگر امت کے پاؤں کے تلے تھا افسر کسریٰ

حرا کے غار کی خلوت تھی اسکے فکر کی حالی
حکومت ، قوم اور آئین کی اس نے بنا ڈالی

رھا بیدار راتوں کو وہ اپنی قوم کا رھبر
کیا آرام تب امت نے جا کر تخت خسرو پر

وہ تیغ اسکی تھی جس سے رن میں لوھا موم ھوتا تھا
نمازوں میں مگر اشکوں کے موتی وہ پروتا تھا

دعا نصرت کی کرتا تھا تو تیغ آمین کہتی تھی
کہ سلطانوں کی نسلیں کاٹنے والی تھی تیغ اسکی

نئے آئین کی اس نے زمانہ میں بنا ڈالی
پرانی امتوں کی مسندوں کو کر دیا خالی

محمد نے در دنیا کو کھولا دیں کی کنجی سے
ہؤا پیدا نہ ایسا لال کوئی بطن گیتی سے

بڑے چھوٹے میں کرنا امتیاز اسکو نہ بھاتا تھا
غلام اپنے کو اپنے ساتھ وہ کھانا کھلاتا تھا

پیمبر کے حضور اک جنگ میں لائے گئے قیدی
کہ شامل جن اسیروں میں تھی حاتم طائی کی بیٹی

پڑی تھی پاؤں میں زنجیر، بے پردہ تھی بیچاری
جھکائے اپنی گردن کو کھڑی تھی شرم کی ماری

نبی نے دیکھ کر یوں با حیا لڑکی کو بے پردہ
خود اپنی بخش دی چادر کہ اُس سے ڈھانک لے چہرہ

ہم اُس خاتون طے سے بھی حقیقت میں ہیں عریاں تر
ہمیں قومیں جہاں کی دیکھتی ہیں آج بے چادر

ہمیں محشر میں اسکی ذات اقدس کا سہارا ہے
جہاں میں بھی اسی کے ہاتھ میں پردہ ہمارا ہے

سراپا رحم اُسکا لطف، اُسکا قہر، دونو ہی
وہ رحمت دوستوں پر تھی، یہ رحمت دشمنوں پر تھی

کیا داخل در رحمت میں جس نے بد سگالوں کو
دیا پیغام لا تثریب اُس نے مکہ والوں کو*

وطن کی قید سے بیگانہ ہیں توحید کے پیارے
ہے دو آنکھوں میں جیسے اک نگہ، ہم ایک ہیں سارے

اگرچہ رہنے والے ہیں حجاز و چین و ایراں کے
مگر شبنم کے قطرے ہیں سبھی اک صبح خنداں کے

کیا ہے ساقئی بطحا کی آنکھوں نے ہمیں شیدا
ہماری زندگی دنیا میں ہے مثل مے و مینا

نسب کے امتیازوں کی جڑ اُس نے کاٹ کر رکھدی
خس و خاشاک یہ سب پھونک ڈالا آگ نے اُسکی

ہماری ایک خوشبو ہے گل صد برگ کی صورت
وہ یکتا ہے اور اُس سے ہے نظام اپنے کی جمعیت

---

* لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۔ (تمہارے لئے کوئی تعزیر نہیں)
رحمتہ اللعالمین نے فتاح مکہ کے بعد کفار عرب کو یہ کہکر امان دیدی - حالانکہ بحیثیت فاتح وہ اُن سے اُس ظلم و ستم کا انتقام لے سکتے تھے جو اہل مکہ نے خود آنحضرت کی ذات اقدس اور عام مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا تھا ۔

جو آسکے دل میں پوشیدہ تھا وہ راز نہاں ہم ہیں
بلند آس نے کیا نعرہ ، ہوئے جس سے عیاں ہم ہیں

ہے آس کے عشق کی شورش نئے خاموش میں میری
تڑپتے ہیں کئی نغمے پڑے آغوش میں میری

محبت اسکی کیا شے ہے، بتاؤں کیا تجھے ناداں
کہ آسکے ہجر میں اک خشک لکڑی بھی ہوئی گریاں

جہاں میں ہستئی مسلم تجلی گاہ ہے اسکی
بنادے طور جو ذروں کو گرد راہ ہے اسکی

مرا پیکر نمایاں ہوگیا آئینہ سے آسکے
نمود صبح میری ، آفتاب سینہ سے اسکے

تڑپتا ہی رہوں ہردم، تو میں آرام پاتا ہوں
میں محشر کی سحر سے گرم اپنی شام پاتا ہوں

میں اسکا بوستاں ہوں اور وہ ابر بہاری ہے
نم آسکا میرے ہر انگور کی رگ رگ میں ساری ہے

محبت کی زمیں میں بیج میں نے آنکھ کا بویا
ہؤا حاصل مجھے یوں چہرۂ زیبا کا نظارا

دو عالم سے سوا پیاری ہے یثرب کی مجھے مٹی
خنک وہ شہر، وہ بستی، جہاں منزل ہے دلبر کی

دل و جاں سے مجھے محبوب ہے انداز جامی کا
میں پاتا ہوں علاج اسکے سخن میں اپنی خامی کا

معانی کے خزینے شعر میں اُس نے سموئے ہیں
ثنائے خواجۂ کونین میں موتی پروئے ہیں

"کتاب دو جہاں کو ذات اقدس اسکی دیباجہ*
جہاں والے غلام اُسکے ہیں اور وہ سب کا ہے خواجہ"

مئے الفت سے ہوتی ہیں عجب کیفیتیں پیدا
ہے اک تقلید بھی اُن میں، کئی ہیں عشق کے اسما

فن تقلید میں بسطام کا کامل تھا لاثانی
نہ کھایا اُسنے خربوزہ کہ سنت سے تھی لاعلمی†

---

* مولانا عبدالرحمن جامی کا فارسی شعر:
نسخۂ کونین را دیباجہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اُوست
حضرت علامہ نے اس موقعہ پر نقل کیا ہے۔

† حضرت بایزید بسطامی نے خربوزہ کھانے سے محض اسوجہ سے پرہیز کیا کہ انہیں کوئی روایت نہ معلوم ہو سکی کہ رسول مقبول نے یہ پھل کسطرح کھایا ہے۔

تو عاشق ہے، تو ہو محبوب کی تقلید سے محکم
کمند ایسی ہو تیری، صید ہو خود خالق عالم

حرا میں دل کے یکسو ہو کے کچھ مدت اقامت کر
خودی کو ترک کردے اور حق کی سمت ہجرت کر

جو محکم حق سے ہو جائے، خودی کا رخ دو بارہ کر
ہوس کے لات و عزیٰ کے سروں کو پارہ پارہ کر

جہاں میں عشق کی قوت سے کر تیار اک لشکر
ہو درد عشق کے فاران کی چوٹی پہ جلوہ گر

خدائے کعبہ سے پھر تو بڑا انعام پائیگا
تجھے تفسیر اِنی جاعل'' کی وہ بنائیگا*

---

* اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط (قرآن حکیم - پارہ اول - سورہ البقرہ)

خودی سوال سے کمزور ہوتی ہے

زمانہ وہ بھی تھا شیروں پہ جب کرتا تھا تو شاہی
ضرورت نے مگر تجھکو سکھا دی خوئے روباہی

کئے دیتی ہے تجھکو خستہ و درماندہ ناداری
ہے تیرے درد و غم کا باعث اصلی یہ بیماری

یہ فکر آسماں پیما سے رفعت چھین لیتی ہے
یہ قندیل خیال نو سے طلعت چھین لیتی ہے

خم ہستی بھرا ہے تو بھی پی لے اپنے حصے کی
اٹھا لے کیسۂ ایام سے جو ہے تری نقدی

آتر خود اونٹ سے اپنے، یہ ہے فاروق کی سنت
اٹھا مت غیر کا احساں اگر کچھ تجھ میں ہے غیرت*

تو کب تک مانگتا پھرتا رہیگا در بدر منصب
بنائیگا تو کب تک نے کو بچوں کیطرح مرکب

---

*حضرت عمر فاروق اونٹ پر سوار تھے - اُن کے ہاتھ سے تازیانہ گر گیا - آپ نے خود اونٹ سے اُتر کر تازیانہ اٹھا لیا اور اس معمولی کام کیلئے کسی کو زحمت دینا نا مناسب خیال کیا -

وہ فطرت آسمانوں کے پرے جائے نظر جسکی
اُسے احسان غیروں کا دکھاتا ہے رہ پستی

سوال افلاس کو دیتا ہے پہلے سے سوا خواری
گدائی سے گدا کی اور بڑھ جاتی ہے ناداری

گدائی جب خودی کی نظم کے ٹکڑے اڑاتی ہے
خودی کے نخل سینا سے تجلی روٹھ جاتی ہے

پریشاں کر نہ خاک اپنی گدائی کی تگا پو سے
مثال ماہ رزق اپنا تراش آپ اپنے پہلو سے

یہ دنیا تنگ ہو تجھ پر، فلاکت تجھ پہ چھائی ہو
متاع زیست طوفان بلا کی زد میں آئی ہو

کسی کے خوان نعمت سے نہ ڈھونڈ اے بیخبر روزی
کہیں سورج کے چشمے سے بھی لیتا ہے کوئی پانی

مبادا روز محشر یوں قیامت پر قیامت ہو
حضور سرور کونین تو وقف خجالت ہو

فلک پر چاند کو ملتی ہے روزی خوان خاور سے
لئے بیٹھا ہے دل پر داغ وہ احسان خاور سے

خدا توفیق دے تجھکو، تری گردوں سے ٹھن جائے
گدائی سے تو ننگ ملت بیضا نہ بن جائے

بتوں سے پاک کعبے کو کیا تھا جس پیمبر نے
''خدا کا دوست ھے کا سب'' کہا اس حق کے رھبر نے*

کسی کے خوان نعمت کا اٹھائے کیوں کوئی احساں
خمیدہ سر ھو پیش غیر، انساں کو نہیں شایاں

وہ لطف غیر کی بجلی سے تن من کو جلاتا ھے
عوض میں ایک کوڑی کے وہ عزت بیچ کھاتا ھے

خدا کی رحمتیں آس پر، رھے جو دھوپ میں پیاسا
مگر مانگے خضر سے بھی نہ وہ اک جام پانی کا

نہیں شرم گدائی کا پسینہ جس کے ماتھے پر
نمایاں جسکی مٹی میں رھے انساں کے تیور

وہ با ھمت جواں زیر فلک ھے یوں نظر آتا
کہ جیسے فخر و تمکیں سے ھو اک سرو رواں جاتا

تہی دستی سے بڑھ جاتی ھے اسکی اور خودداری
نصیبہ گرچہ سویا ھو، فزوں ھوتی ھے بیداری

* الکاسب حبیب اللہ (حدیث) .

گدائی کا سمندر بھی ھے سیل آتش سوزاں
فراھم خود کرے کوئی تو شبنم ھے در تاباں

حباب آسا جہاں میں ھو تری غیرت کا افسانہ
رھے گر بحر میں بھی تو، نگوں رکھ اپنا پیمانہ

جب خودی عشق و محبت سے مضبوط ہوتی ہے تو
نظامِ عالم کی ظاہر اور پوشیدہ قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے

خودی مضبوط ھوتی ھے جو تاثیر محبت سے
تو کر سکتے ھیں عالم پر حکومت اسکی قوت سے

یہ گل بوٹے ستاروں کے فلک نے جو بنائے ھیں
خودی کے پیڑ سے اسکو یہ غنچے ھاتھ آئے ھیں

خدا کا ھاتھ بن جاتا ھے اس سے ھاتھ انسان کا
دو پارہ جس سے ھو جاتا ھے سینہ ماہ تاباں کا*

---

* معجزۂ شق القمر کی طرف اشارہ ھے ۔

جہاں والے اُسے جھگڑوں میں منصف مان لیتے ہیں
اُسے جمشید و دارا اپنا آقا جان لیتے ہیں

یہ عہد بو علی کی ایک تابندہ روایت ہے
وہ جس کا نام ہندستاں میں درویشی کی عزت ہے

ریاض ہند کا وہ عندلیب نغمہ پیرا تھا
گل رعنا کے افسانے زمانے کو سناتا تھا*

یہ خطہ اُس زمیں کا ہے جو آتش سے ہوئی پیدا
ہوا دی اُسنے دامن سے، اسے جنت بنا ڈالا

مرید ایک اُسکا اک دن جانب بازار جاتا تھا
شراب بو علی کے نشہ میں سرشار جاتا تھا

سواری شہر کے حاکم کی اُس جانب سے آنکلی
جلو میں جسکے آتی تھی جماعت چوبداروں کی

پکارا پیشرو اُنکا، "ارے او عقل کے اندھے!
پرے ہٹ راستے سے، دیکھ، ہم حاکم کے ہیں بندے"

---

*حضرت بوعلی قلندر کا شعر ہے:
مرحبا اے بلبل باغ کہن   از گل رعنا بگو با ما سخن

مگر درویش غرق اپنے خیالوں میں، جھکائے سر
چلا جاتا تھا رہ اپنی، جہاں سے بے خبر ہو کر

شراب کبر سے بد مست تھا وہ چوبدار ایسا
عصا آسنے آٹھایا اور سر درویش پر مارا

گیا درویش آس رستے سے ہو کر سخت آزردہ
قدم تھے سست، دل بھاری تھا، چہرہ زرد و افسردہ

حضور بو علی پہنچا تو کی فریاد اور زاری
جھڑی اک آنسوؤں کی اسکی آنکھوں سے ہوئی جاری

فراز کوہ پر بجلی گرائے آسماں جیسے
زبان شیخ غصے میں ہوئی شعلہ فشاں ایسے

رگ جاں سے نکلکر آگ نے پھر یوں غضب ڈھایا
دبیر اپنے سے حضرت نے مخاطب ہو کے فرمایا

اٹھا اپنا قلم، اے لکھنے والے! میرا فرماں لکھ
فقیر راہ کی جانب سے نامہ سوئے سلطاں لکھ

''ترے عامل نے میرے ایک بندے کو کیا زخمی
دھکتی آگ آسنے ڈال لی ہے جان پر اپنی

سزا دے ایسے عامل کو، ھے اسمیں خیریت تیری
و گر نہ بخش د ونگا اور کو میں سلطنت تیری''

جو اُس اللہ کے پیارے کا خط سلطان تک پہنچا
تو جسم شہ پہ طاری سر سے پا تک ایک لرزہ تھا

بنا سرمایۂ آلام شاھنشاہ کا پیکر
مثال آفتاب شام رنگ اُسکا اڑا یکسر

جکڑ کر لیگئے عامل کو زنجیروں میں دفتر سے
معافی یوں شہ ذیجاہ نے چاھی قلندر سے

وہ خسرو ھند میں سرتاج تھا جو خوش نواؤں کا
ضمیر قدرت خالق تھا منبع جسکے نغموں کا

مثال ماہ جسکی روشن و پر نور تھی فطرت
اُسے سونپی گئی نازک سفارت کی اھم خدمت

بجایا یوں ستار اُس نے حضور بو علی جا کر
کہ رقت ھو گئی طاری دل و جان قلندر پر

پہاڑوں کی طرح مضبوط ظاھر میں جو شوکت تھی
سمجھ سکتے ھیں نکتہ ور کہ اک نغمے کی قیمت تھی

دل درویش پر نشتر زنی اچھی نہیں ہوتی
خود اپنے جان و دل سے دشمنی اچھی نہیں ہوتی

نفیٔ خودی کا مسئلہ بنی نوع انسان کی مغلوب قوموں کی اختراعات میں سے ہے

سنا ہے کیا کبھی تم نے یہ قصہ عہد ماضی کا
کسی سر سبز وادی میں تھا ڈیرہ بھیڑ بکری کا

بہت تھی گھاس، نسل اُن کی ترقی کرتی جاتی تھی
نہ بھولے سے بھی فکر اُن کو درندوں کی ستاتی تھی

نئی افتاد لیکن آ پڑی، گذری بہار آخر
ہوُا تیر بلا سے سینہ بکری کا فگار آخر

وہاں پر خیل شیروں کا کسی جنگل سے آنکلا
کیا اُس نے چراگہ پر یکا یک رات کو دھاوا

گرا لینا، مٹا دینا، یہ قوت کا طریقہ ہے
مظفر ہو کے رہنا اسکی فطرت کا تقاضا ہے

بجایا شیر نے ڈنکا شہنشاہی کا قوت سے
کیا محروم یکسر بز کو آزادی کی نعمت سے

نہ کرتا شیر کیونکر صید، اسکی خو شکاری تھی
چرا گہ گوسفندوں کے لہو سے لال ساری تھی

انہی میں ایک بکری تھی، بہت زیرک، بڑی دانا
پرانی گھاگھ، نٹ کھٹ، اک زمانہ اس نے دیکھا تھا

وہ اپنی قوم کی حالت پہ پیچ و تاب کھاتی تھی
ستمگاری سے شیر نر کی، چھلنی اسکی چھاتی تھی

زباں پر گردش تقدیر کے شکوے ہوئے جاری
مگر یہ سوچ تھی دل میں، کوئی تدبیر ہو کاری

بنے جب جان پر آکر، یہ عادت ہے ضعیفوں کی
وہ عقل کاراں سے جستجو کرتے ہیں حیلوں کی

غلامی میں مصیبت عقل کو مہمیز ہوتی ہے
کہ تب تدبیر کی قوت زیادہ تیز ہوتی ہے

جنون انتقام اپنا غلامی پال لیتی ہے
تو چالیں سوچتی ہے، طرح فتنہ ڈال دیتی ہے

کہا دل سے، کھلے کیسے ہمارا عقدۂ مشکل
نہیں پیدا ہمارے غم کے دریا کا کوئی ساحل

ملیگی شیر سے بکری کو، طاقت سے نہ آزادی
یہاں ہے ساعد سیمیں، وہاں بازو ہے فولادی

نہیں ممکن کہ ہو وعظ و نصیحت کا اثر ایسا
کہ خو بو بھیڑئے کی گوسفندوں میں بھی ہو پیدا

بنانا شیر کو بکری مگر حکمت سے ممکن ہے
وہ اپنے آپ کو بھولے مری محنت سے ممکن ہے

کیا الہام کا دعویٰ—یہ اسکو دور کی سوجھی
وہ واعظ بن کے پہنچی بزم میں خونخوار شیروں کی

پکاری، جھوٹ اور شیخی کی تم نے طرح ڈالی ہے
ڈرو اُس یوم سے جسکی نحوست رہنے والی ہے

خدائے پاک نے بخشی ہے قوت مجھکو روحانی
میں شیروں کی طرف آئی ہوں مرسل ہو کے یزدانی

میں بہر دیدۂ بے نور، بنکر نور آئی ہوں
میں ہوں مامور حق، اپنا نیا دستور لائی ہوں

برے کاموں سے توبہ ہو تو جائے دل کی بیماری
ذرا کر سود کی بھی فکر اے محو زیاں کاری

وہ ہے بد بخت جو زور آوری، تندی کے گن گائے
نہ ہوگی زندگی محکم، خودی جب تک نہ مٹ جائے

غذائے روح نیکوں کے لئے ہیں گھاس کے تنکے
کریں جو گوشت خوری ترک، مقبول خدا ہونگے

تجھے دانتوں کی تیزی نے کیا ہے دھر میں رسوا
یہ تیرے دیدۂ ادراک کو کرتی ہے نابینا

ضعیفوں کے لئے اللہ نے جنت بنائی ہے
ہو پونجی جسکی طاقت، اسکی گھاٹے کی کمائی ہے

تلاش سطوت و عظمت میں شر کی ہے عملداری
امارت سے ہیں بہتر تنگدستی اور لاچاری

نہیں ہے گھات میں بجلی جو دانہ ایک دانہ ہے
جونہی خرمن بنا، وہ برق سوزاں کا نشانہ ہے

اگر عاقل ہے تو، صحرا نہ بن، رہ صورت ذرہ
کسی خورشید کی طلعت سے تجھکو بھی ملے حصہ

تو نازاں ہے کہ ذبح میش کی تجھکو ملی طاقت
کر اپنے آپ کو تو ذبح گر مقصود ہے عزت

ہلا دیتی ہیں قصر زندگی کی ساری بنیادیں
یہ زور و جبر و قہر و انتقام و ظلم کی گھاتیں

نہ رہتا زیر پا سبزہ تو کیسے بار بار آگتا
فنا کی نیند سے دھو دھو کے آنکھیں کیسے جاگ اٹھتا

اگر کچھ عقل رکھتا ہے خودی کا چھوڑ افسانہ
نہیں بھولا جو اپنا آپ، دیوانہ ہے دیوانہ!

جو کر لے بند آنکھوں کو لبوں کو اور کانوں کو
تو تیرا فکر خاطر میں نہ لائے آسمانوں کو

یہ عالم کی چرا گہ ہیچ ہے، راحت سے خالی ہے
نہ اس پر بھول ہرگز، اسکی ہستی بس خیالی ہے

تھکا ڈالا تھا شیروں کو مسلسل سخت کوشی نے
کیا تھا گھر دلوں میں آن کے ذوق تن پرستی نے

یہ خواب آور نصیحت شیر کو بھائی، تھا سادہ خو
ابھی تک خام تھا، بکری کا اُس پر چل گیا جادو

کیا تھا مدتوں تک گوسفندوں کا شکار اُس نے
مگر اب گوسفندوں کا کیا دیں اختیار اُس نے

قناعت کر گیا یوں شیر نر جب گھاس کھانے پر
گہر شیری کا آخر رہگیا یکسر خزف بنکر

گئی دانتوں کی تیزی رنگ لائی گھاس کی صحبت
نہ شعلہ ریز آنکھوں میں رہی پہلی سی وہ ہیبت

حرارت قلب کی جاتی رہی سینے کے اندر سے
ہؤا گم جوہر آئینہ، آئینے کے اندر سے

نہیں تھا کوشش کامل کا اب اصلا جنوں باقی
تقاضا تھا عمل کا اور نہ دل میں جوش خوں باقی

ہوئے گم اقتدار و عزم و استقلال شیروں سے
گئے پھر اعتبار و عزت و اقبال شیروں سے

وہ شہزور آہنیں پنجے ہوئے بے زور سب اُن کے
دلوں کے رہگئے لاشے، بنے تن گور سب اُن کے

گھٹا جب زور تن، جاں پر بڑھا تب خوف کا سایہ
اڑایا خوف جاں نے ھمت عالی کا سرمایہ

مرض سو ساتھ لے آئی، جو اک بے ھمتی آئی
اسی سے کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی آئی

فسون بز سے ایسے سو گئے، بھولے کمال اپنا
کیا تہذیب سے موسوم شیروں نے زوال اپنا!

افلاطون یونانی کے افکار سے پرہیز واجب ہے

وہ افلاطون، وہ دیرینہ راھب، فلسفی پہلا
ھے دنیا کے پرانے گوسفندوں میں شمار اسکا

ھؤا رھوار اسکا فلسفہ کی ظلمتوں میں گم
نہ کوھستان ھستی میں جمے اسکے کہیں پرسم

کیا یوں سرپہ نا محسوس کا جادو سوار اسنے
کہ چھینا ھاتھ، کان اور آنکھ سے سب اعتبار اسنے

کہا اُس نے کہ راز زندگی مرنے میں پنہاں ہے
جو گل ہو شمع، حاصل اسکو سو جلووں کا ساماں ہے

تخیل پر ہمارے حکمراں ہے آب و تاب اُسکی
سلا کر دور کر دیتی ہے دنیا سے شراب اُسکی

نہیں تھا آدمی کے بھیس میں اک بھیڑ سے بڑھکر
مسلط ہیں مگر افکار اُسکے قلب صوفی پر

لگا کر عقل کے پر وہ فلک پر اڑتا رہتا تھا
مگر اس عالم اسباب کو افسانہ کہتا تھا

تباہی اسکی حکمت سے ہوئی ہستی کے اجزا کی
قلم کی شاخ اُس نے زندگی کے سرو رعنا کی

دکھایا فکر نے اُسکے، زیاں کو سود کی صورت
دی اُسکے فلسفہ نے بود کو نابود کی صورت

ہوئی خوابیدہ فطرت اُسکی، خواب اک ہو گیا پیدا
جو کھولی چشم ہوش اُسنے، سراب اک ہو گیا پیدا

رہی نا آشنا ذوق عمل سے اُسکی کجرائی
بنا وہ بے حقیقت شے کا جان و دل سے شیدائی

بتایا واهمه تخئیل کا، 'موجود' کو اسنے
حقیقت بخشدی 'اعیان نا مشہود' کو اسنے*

جو زندہ دل ہیں اُن کو عالم امکاں ہی اچھا ہے
جو مردہ دل ہیں اُن کو عالم اعیاں ہی اچھا ہے

خرام ناز کی اسکے غزالوں میں نہیں قدرت
حرام اسکے چکوروں پر ہوئی رفتار کی لذت

---

* افلاطون کے نظریۂ اعیان کی طرف اشارہ ہے۔ مختصراً افلاطون کا خیال تھا کہ عالم امکان میں جو شے بھی ہمارے مشاہدے میں آتی ہے حقیقی نہیں بلکہ اُس ابدی آفاقی حقیقت یا عین کی نقل یا عکس ہے جو عالم مثال میں واقع ہے اور جسکا تصور ہمارے ذہن میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً حسین اشیا تو دنیا میں کئی ہیں لیکن حسن محض کا ایک خاص تصور ہمارے دماغ میں ہونا چاہئے جس سے تقابل کے بعد ہم کسی شے کے متعلق حکم لگاتے ہیں کہ وہ حسین ہے۔ افلاطون کے نزدیک اس موضوعی تصور حسن کے مترادف ایک ابدی آفاقی حقیقت کہیں ماورائے زمان و مکان موجود ہونی چاہئے جو اُس شے کا جوہر یا عین ہے جسکی نقل یا عکس ہمارے دماغ میں ہے اور جس عکس کی مختلف اشکال ہم عالم امکاں میں پاتے ہیں۔ یہ جوہر یا عین بھی تصور محض ہے لیکن یہ تصور کسی دماغ سے متعلق نہیں۔ گو اس کا ادراک بذریعہ عقل ہو سکتا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت عالم امکاں کی حیثیت وہم و افسانہ سے زیادہ نہیں رہتی۔

نہیں ہے رم کی طاقت اسکی شبنم کے نصیبے میں
وہ طائر آسکا ہے، باقی نہیں دم جسکے سینے میں

جسے کچھ ذوق آگنے کا نہیں وہ دانہ ہے آسکا
تڑپنے کے مزے سے بے خبر پروانہ ہے آسکا

جہاں کے شور و غوغا سے سرا سمیہ ہؤا ایسا
سوائے بھاگ جانے کے نہ آس راہب کو کچھ سوجھا

ہؤا افسردہ شعلے سے حرارت کا تمنائی
آسے افیون کی پروردہ اک دنیا پسند آئی

نشیمن سے اڑا بے باک ہو کر آسماں تک وہ
مگر پھر لوٹ کر آیا نہ ہرگز آشیاں تک وہ

خم گردوں میں جاکر ہوگیا فکر آسکا آخر گم
نہیں معلوم، کیا کہئے، وہ تلچھٹ ہے کہ خشت خم

ہوئیں مسموم اسکے فکر سے اقوام عالم کی
عمل کا ذوق کھو بیٹھیں، ہوئیں نیندوں کی وہ ماتی!

حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ *

تپش خوں کی دل انساں میں داغ آرزو سے ہے
یہ مشت خاک نورانی چراغ آرزو سے ہے

تمنا ہی سے جام زندگانی ارغوانی ہے
تمنا ہی سے اس دنیا کی ہر شے پر جوانی ہے

کتاب زندگی میں ہے بس اک تسخیر کا مضموں
تمناہی سے ملتا ہے ہمیں تسخیر کا افسوں

شکاری زندگی ہے اور تمنا دام ہے گویا
تمنا حسن کو اک عشق کا پیغام ہے گویا

---

* مثنوی کے پہلے ایڈیشن میں اقبال نے چند اشعار درج کئے تھے جن میں خواجہ حافظ کے افکار اور اُن کے اثرات پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ اسپر صوفیا اور صوفی منش حضرات کے حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی۔ علامہ کا مقصد اُس تصوف کے خلاف جہاد تھا جو قوموں کو راہبانہ ترک دنیا، کاہلی اور جمود کی طرف لیجاتا ہے۔ خواجہ حافظ کے معتقدات سے چنداں سروکار نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے بعد کی ایڈیشن میں وہ اشعار حذف کر دئے اور اُن کی جگہ ان اشعار میں اپنے ادبی اصول کی تشریح فرمائی۔ ملاحظہ ہو اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نام خط۔ (حصہ اول)

امنگیں دمبدم کیسے، کہاں سے پھوٹ آتی ہیں
نوائے زندگانی میں جو لے بن کر سماتی ہیں

جمال و حسن و زیبائی سے جو شے دل لبھاتی ہے
بیابان طلب میں راستہ ہم کو دکھاتی ہے

اُتر جاتا ہے گہرائی میں دل کی جب جمال اُسکا
جگا دیتا ہے دل میں آرزوؤں کو خیال اُسکا

بہار آتی ہے باغ آرزو میں حسن کے دم سے
تمنائیں نمو پاتی ہیں چشم حسن کے نم سے*

زمین قلب شاعر حسن کے جلووں کی بستی ہے
ضیائے حسن اسکے نخل سینا سے برستی سے

نگہ ایسی ہے اُسکی، خوب کو جو خوبتر کر دے
وہ افسوں اسکا ہے فطرت کو جو محبوب تر کردے†

---

*متبادل ترجمہ یوں بھی ہوا تھا:
ریاض آرزو کو حسن پیغام بہاراں ہے
حیات آرزو منت کش چشم نگاراں ہے

†متبادل ترجمہ:
نظر اسکی طرحداروں کو دیتی ہے طرحداری
فسوں سے اُسکے ہو جاتی ہے فطرت اور بھی پیاری

اُسی کی نے نوازی سے نوا سیکھی ھے بلبل نے
اُسی کے رنگ سے پائی دلاویزی رخ گل نے

دل پروانہ میں شاعر کا ھی سوز نہانی ھے
اُسی کے فیض سے رنگیں محبت کی کہانی ھے

ھیں اُسکے آب و گل میں بحروبر کی وسعتیں پنہاں
کئی تازہ جہانوں کے دل شاعر میں ھیں امکاں

دماغ اُسکا وہ بستاں، نادمیدہ جس میں ھیں لالے
کچھ اسمیں ان سنے نغمے، کچھ اِس میں ان سنے نالے

ھؤا فکر رسا سے ھم نشیں وہ چاند تاروں کا
وہ نا زیبا سے بیگانہ ھے، خالق ھے نگاروں کا

ھے واقف ظلمتوں میں چشمۂ حیواں کے رستوں سے
ھے باغ زندگی کی آبیاری اسکے اشکوں سے

تھکے ماندے ھیں، اپنی آنکھ سے مستور ھے منزل
ھم اپنی چال سے اکھڑے ھوئے ھیں، دور ھے منزل

صدا آتی ھے اسکے بلبل شیدا کی کانوں میں
نیا اک ولولہ کرتی ھے پیدا خستہ جانوں میں

که لیجائے بہشت زندگی میں کھینچ کر ہم کو
بنادے حلقۂ کامل وہ قوس زیست کے خم کو

رواں ہیں قافلوں کے قافلے اسکی درا سنکر
بڑھے جاتے ہیں اسکی رس بھری نے کی نوا سنکر

ہمارے صحن گلشن میں نسیم آسکی جو آتی ہے
گل و لالہ میں گھل مل کر وہ نرمی سے سماتی ہے

فریب ایسا ہے آسکا، زندگی جس سے خود افزا ہے
خود اپنی محتسب ہے اور پیہم ناشکیبا ہے

سجا کر خوان، شاعر اہل عالم کو بلاتا ہے
مثال باد ارزاں کر کے سوز اپنا لٹاتا ہے

عبث ہے زندگی اس قوم کی جو مرگ ساماں ہے
مصاف زیست سے جس قوم کا شاعر گریزاں ہے

برا آئینے میں آسکے بھلا معلوم ہوتا ہے
جگر میں آسکا نوشینہ بھی سو نشتر چبھوتا ہے

اڑا لیتا ہے اسکے لب کا بوسہ تازکی گل سے
مٹا دیتا ہے آڑنے کی ہوس تک قلب بلبل سے

ترے اعصاب میں سستی ھے ساری اُسکی افیوں کی
متاع زندگی ھوتی ھے قیمت اسکے مضموں کی

وہ سرو بوستاں سے ذوق رعناتی اڑاتا ھے
دم بے سوز سے شاھیں کو بھٹ تیتر بناتا ھے

وہ مچھلی ھے مگر سینے سے سر تک شکل انساں ھے
بنات البحر کی مانند أس سے خطرۂ جاں ھے*

کھویا اسکے افسون نوا سے ھوش کھوتا ھے
وہ اُسکی ناؤ گہرے پانیوں میں لا ڈبوتا ھے

وہ اپنے گیت سے قوت ترے دل سے چراتا ھے
وہ اپنے سحر سے مرنے کو جینا کر دکھاتا ھے

مٹا دیتا ھے تیرے دل سے خواھش زندگانی کی
اڑا لیتا ھے تیری کان سے وہ لعل عنابی

---

* بنات البحر - سمندر کی تین پریاں ھیں جنھیں انگریزی میں syrens کہتے ھیں - ملاحوں کے توھمات کے مطابق اُن کے جسم کا زیریں حصہ مچھلی کا ھوتا ھے اور بالائی حصہ انسان کا اور جہاز ران اُن کے نغموں سے بے راہ ھو کر خطرناک پانیوں میں ڈوب جاتے ھیں - یونانی علم الاصنام میں اُن کا ذکر آتا ھے -

زیاں کی شکل دیکر سود کو، کیا گل کھلاتا ھے
ھر اچھے کو برے کے روپ میں لا کر دکھاتا ھے

بنا کر گرد تیرے اک خیالوں کا پریخانہ
عمل کی قوتوں سے تجھکو کرتا ھے وہ بیگانہ*

تھکا ھے وہ، تھکا دیتا ھے ھمکو بھی کلام آسکا
بنا دیتا ھے بے جاں انجمن کو دور جام آسکا

تڑپنی ھی نہیں ھے کوئی بجلی اسکے نیساں میں
نہیں ھے جز سراب رنگ و بو اسکے گلستاں میں

صداقت کی جھلک سے دور رھتا ھے جمال اسکا
کوئی بے عیب موتی اسکے دریا میں نہیں پیدا

ھے بیداری سے بڑھکر خواب کی مستی اُسے بھاتی
ھماری آگ اسکی سانس سے ھے سرد ھو جاتی

سم قاتل ھے دل کو اسکے بلبل کی نوا گویا
ھے اسکے خرمن گل کے تلے مار سیہ سویا

---

* متبادل ترجمہ:
خیالوں کے سمندر میں تجھے وہ غوطہ دیتا ھے
صلاحیت عمل کی تجھ سے یکسر چھین لیتا ھے

بچو تم اسکے خم سے، ساغر روشن سے، مینا سے
نظر افروز ہے لیکن بچو تم اسکی صہبا سے!

تو اے جو وقف مد ہوشی ہے اسکی تیز صہبا سے
سحر ہوتی ہے تیری رات اسکے شرق مینا سے

ہؤا بزم خموشاں اسکے نغموں سے ہے تیرا دل
تجھے ملتا رہا کانوں کے رستے سے سم قاتل

سن اے شاعر! تنزل کا نشاں انداز ہے تیرا
ہؤا جو سر سے بیگانہ وہ تار ساز ہے تیرا

تجھے بیکار ایسا کر گئی تیری تن آسانی
تری ہستی جہاں میں ہوگئی ننگ مسلمانی

بنا سکتے ہیں بے بس باندھ کر تجھ کو رگ گل سے
تجھے مجروح کر سکتے ہیں باد صبح کے جھونکے

ہؤا ہے عشق عالم میں تری فریاد سے رسوا
بنایا ہے ترے خامہ نے اسکا کچھ عجب نقشہ

ترے آزار سے رخسار اسکا زرد ہوتا ہے
ترے بے سوز دم سے اسکا شعلہ سرد ہوتا ہے

کیا ہے خستہ جاں اُسکو بھی تیری خستہ جانی نے
بنایا ناتواں اسکو ہے تیری ناتوانی نے

فقط طفلانہ گریہ اُسکے پیمانے کی قسمت ہے
دھؤاں آھوں کا اسکی منزل ویراں کی زینت ہے

ہے اُسکی سر خوشی کو، بھیک کی، میخانہ سے کافی
جھلک چوری چھپے کی روزن کاشانہ سے کافی

وہ بیمار ازل، افسردہ، آزردہ جہاں بھر سے
نکل جاتا ہے دم اسکا بس اک درباں کی ٹھوکر سے

ہؤا نے کی طرح لاغر وہ رنج و غم کے حملوں سے
نہیں تھکتی زباں اسکی کبھی دوراں کے شکووں سے

خوشامد اور کینہ، جوھر آئینہ ہیں اُسکے
ضعیفی، ناتوانی، ھمدم دیرینہ ہیں اُسکے

وہ تیرہ بخت و دوں فطرت، شکستوں کیلئے نامی
وہ ناشائستۂ محفل، وہ وقف یاس و ناکامی

لٹا اُسکی فغاں سے تیرا جان و دل کا سرمایہ
ہؤا محروم لطف خواب سے بیچارہ ھمسایہ

کرو اُس عشق کا ماتم، ہے شعلہ جسکا خاکستر
حرم میں جو ہؤا پیدا، مرا جو دیر میں جاکر

ترے کیسے میں گر نقد سخن طبع رسا بھر دے
عیار زندگی پر تو کھرا کھوٹا الگ کر لے

عمل کو فکر کی شمع درخشاں رہ دکھاتی ہے
کہ جیسے رعد سے کچھ پہلے بجلی کوند جاتی ہے

یہ لازم ہے ادب میں فکر صالح پھر سے پیدا ہو
عجم کا جام خالی ہے، عرب کا پھر سے شیدا ہو

تو سلمائے عرب کو پھر محبت کا سندیسہ دے
کہ شام کرد سے صبح حجازی پھر دمک اٹھے*

---

* ادبیات عرب میں عموماً معشوقہ کا نام سلمیٰ ہوتا ہے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ ادبیات میں اسلامی نقطۂ نظر ملحوظ رہے۔ دوسرے مصرع میں شیخ حسام الحق ضیاء الدین کے مقولہ اَمسَیتُ کُردِیّاً اَصبَحتُ عَرَبِیّاً کی طرف اشارہ ہے۔ روایت ہے کہ شیخ موصوف جو کرد تھے طلبہ کی ایک جماعت کے پاس آئے اور خواہش ظاہر کی کہ انہیں اسرار باطنی کی تعلیم دیجائے۔ طلبہ نے شوخی سے انہیں بتایا کہ اگر وہ پاؤں سے رسی باندھ کر الٹے لٹک جائیں اور پھر (باقی صفحہ ٥٧ پر)

چمن زار عجم میں پھول تو چنتا رہا برسوں
بہار ہند و ایراں پر تو سر دھنتا رہا برسوں

ذرا پھر گرمئی صحرا کا تیرا جسم خو گر ہو
مئے خرما کا تیرے ہاتھ میں دیرینہ ساغر ہو

پڑا رہنے دے سر کو آتشیں آغوش میں اسکے
تن نازک سے اسکی گرم صر صر کو لپٹنے دے

تجھے رخت حریری سے بہت مدت رہی نسبت
بنا اب کھردرے کرپاس کے ملبوس کی عادت

رہا قرنوں تلک رقصاں تو رنگیں لالہ زاروں میں
مثال گل نہایا ہے تو شبنم کی پھواروں میں

ذرا اب ریگ سوزاں کے تھپیڑوں کے مقابل ہو
لگا زمزم میں غوطہ، بے ریا دل تجھکو حاصل ہو

رہیگا مثل بلبل محو فریاد و فغاں کب تک
چمن زاروں میں رکھیگا تو اپنا آشیاں کب تک

(صفحہ ٥٦ سے آگے) چند الفاظ کا جو انہیں بتائے گئے ورد کرتے رہیں تو اُن کا ضمیر روشن ہو جائے گا۔ انہوں نے تمام رات ایسا ہی کیا۔ خدائے تعالیٰ نے ان کے ایمان راسخ اور اخلاص کے طفیل انہیں روشن ضمیری عطا فرمائی اور ولایت سے سر فرازا۔

بلندی کوهساروں کی نشمین کیوں نه هو تیرا
دیا هے دام نے تیرے هما کو مرتبه اونچا

بنا وه آشیاں کهیلے جو برق و رعد و باراں سے
بلندی میں جو بر تر هو کنام جره بازاں سے

هوں تیرے دست و بازو زندگی کی رزم کے شایاں
جلادے تجهکو یکسر زندگی کا شعلهٔ سوزاں!

تربیتِ خودی کے تین مرحلے

مرحلهٔ اول : اطاعت

شعار زندگی اشتر کا، خدمت اور محنت هے
وه اپنے کام میں هے مستعد، صبر اسکی عادت هے

سفر میں هو تو کم آواز هوتا هے قدم اسکا
وه اهل کا رواں کے واسطے هے کشتئی صحرا

مزین اسکے نقش پا سے هر دشت اور بیشه هے
وه کم کهاتا هے، کم سوتا هے، محنت اسکا پیشه هے

چلا جاتا ہے مستی میں اٹھائے بار محمل کا
نشاط راہ سے رقصاں وہ رخ کرتا ہے منزل کا

وہ اپنی چال کی کیفیتوں میں مست چلتا ہے
سفر میں وہ سوار اپنے سے صابر تر نکلتا ہے

اگر بار فرائض سے نہ تو بھی جی چرائیگا
پسندیدہ ٹھکانا بار گاہ حق سے پائیگا*

اطاعت کی طریقت میں برابر صبر لازم ہے
جو مختاری کی خواہش ہو تو مشق جبر لازم ہے†

اطاعت کیمیا ہے، جس سے خاکستر بنے گوہر
جو شعلہ سرکشی کر لے، نہیں ہے خس سے وہ بہتر

---

* عندہ، حسن المآب ۔
قران حکیم ۔ پارہ سوم ۔ سورہ آل عمران

† الہیات اسلامی کے مسئلہ جبرو اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ اور سچی آزادی پابندئی احکام سے حاصل ہوتی ہے ۔ حضور سرور کائنات کے ارشاد کے مطابق مومن کا ایمان اس بارے میں جبرو اختیار کے بین بین ہونا چاہئے ۔ انسان نہ کاملاً مختار ہے نہ کلی طور پر مجبور ۔ اس بارے میں نہ صرف عوام بلکہ خواص میں بھی غلط فہمیاں ہیں ۔

مہ و پرویں کو گر تسخیر کرنے کی کوئی ٹھانے
کسی آئیں کی زنجیروں کو اپنا رہنما جانے

ہوا زنداں میں رہتی ہے تو بنتی ہے گل خوشبو
رہی جب قید میں خوشبو، بنی وہ نافۂ آہو

ستارے آسمانوں پر رواں ہیں جانب منزل
اطاعت اپنے آئیں کی وہ کرتے ہیں بجان و دل

نمو کے دیں پہ قائم ہو کے سبزہ لہلہاتا ہے
جو آئیں چھوڑ دے، پاؤں تلے وہ روندا جاتا ہے

رہے داغ جگر تازہ، یہ ہے قانون لالہ کا
رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اس سے خون لالہ کا

ملے جب وصل کے آئیں سے، قطرے بن گئے دریا
یہ وہ آئیں ہے جس کے زور سے ذرے بنے صحرا

قوی ہر شے کا باطن ہے کسی آئیں کی حکمت سے
تجھے زیبا نہیں، غافل ہو اس سامان قوت سے

تو اے آزاد دستور کہن پھر بندۂ دیں ہو
ترے پاؤں کی زینت پھر وہی زنجیر سیمیں ہو

کبھی آئیں کی سختی کا گلہ لب پر نہ آنے دے
حدود مصطفیٰ سے تو قدم باھر نہ جانے دے

مرحلۂ دوم: ضبطِ نفس

ھے تیرا نفس خود پرور، چٹورے اونٹ کی صورت
ھے اسکی خود پرستی، خود سواری، خود سری عادت

عناں لے ھاتھ میں اسکی نمایاں اپنا جوھر کر
خزف ھے گر تری ھستی تو اس نسخے سے گوھر کر

رواں جس نے نہ اپنے آپ پر فرماں کیا اپنا
تو اس نے سر غلامی میں کسی کی دیدیا اپنا

ازل کے دن تری تعمیر جب مٹی سے ھوتی تھی
محبت اور خوف اس میں مشیت خود سموتی تھی

کئے ضم خوف دنیا ، خوف عقبیٰ، خوف جاں اسمیں
ملا یا خوف آلام زمین و آسماں اسمیں

محبت مال و دولت کی، وطن کی، ڈالدی اسمیں
محبت خویش و رشتہ دار و زن کی ڈالدی اسمیں

مرکب خاک پانی کا پرستش تن کی کرتا ہے
حیا سے دور رہتا ہے، بری باتوں پہ مرتا ہے

عصائے لا الہ گر ہاتھ میں تیرے رہے دائم
نہیں ممکن طلسم خوف کوئی رہ سکے قائم

بنایا خانۂ حق جس نے اپنی روح کو، تن کو
نہیں ممکن جھکائے پیش باطل اپنی گردن کو

کبھی سینے میں اسکے خوف رہ پائے نہیں ممکن
کبھی رعب اس پہ غیر اللہ کا چھائے نہیں ممکن

جونہی اقلیم میں لا کی کوئی آباد ہوتا ہے*
زن و اولاد کے بندھن سے وہ آزاد ہوتا ہے

وہ کٹ کر ماسوی سے، رشتہ حق سے جوڑ لیتا ہے
اشارہ ہو، چھری حلق پسر پر پھیر دیتا ہے

---

* یعنی سوائے اللہ کے باقی سب کی ربوبیت سے انکار کرتا ہے۔

اگرچه ایک ہے، اسمیں ہے لیکن قوت لشکر
کہ قیمت اسکی نظروں میں ہے جاں کی باد سے کمتر

صدف ہے لاالہ گویا، نماز اسکے لئے گوہر
ہے زائر قلب مسلم اور نماز اسکو حج اصغر

یہ سچ ہے دست مسلم میں نماز اک تیز خنجر ہے
بدی اور بے حیائی کا وہ جس سے کاٹتا سر ہے*

ہراساں کیوں نہ ہو روزے سے بھوک اور پیاس کا لشکر
کہ اس سے خیبر تن پروری ہوتا ہے آخر سر

فروزاں حج سے ہو جاتی ہے فطرت مرد مومن کی
یہ ھجرت کا سبق دیکر سکھاتا ہے وطن سوزی

یہ طاعت وہ ہے بنتی ہے جو جمعیت کا سرمایہ
مہیا کرتی ہے اوراق ملت کا یہ شیرازہ

فنا کرتی ہے دولت کی خبث کو زکوۃ زر
مساوات آشنا کرتی ہے ملت کو زکوۃ زر

---

* اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِؕ (پارہ ٢١ - رکوع ١ - عنکبوت)
تحقیق نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

یہ حتیٰ تنفقوا سے دل کی قوت کو بڑھاتی ہے
زر افزا ہے مگر زر کی محبت کو گھٹاتی ہے*

یہ وہ ساماں ہیں مقصد جنکا استحکام ہے تیرا
تو پختہ ہے جو محکم ہو گیا اسلام ہے تیرا

جو حاصل تجھکو ورد 'یا قوی' سے استواری ہو
تو اپنے اشتر خاکی پہ پھر تیری سواری ہو

مرحلۂ سوم: نیابتِ الٰہی

شتر بانی جو تو سیکھے ملے تجھکو جہاں بانی
کریگا زیب سر تو اس طرح تاج سلیمانی

جہاں آرا رہیگا تو، جہاں جب تک جہاں ہو گا
فنا شوکت نہ ہو جسکی تو ایسا حکمراں ہوگا

---

* لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (پارہ ۴۔ رکوع ۱) ۔ جب تک اُن چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں، (راہ خدا میں) صرف نہ کروگے ۔ کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے ۔

جہاں میں نائب حق ہو کے رہنا کامرانی ہے
عناصر پر حکومت ہو تو سچی شادمانی ہے

ہے عالم ایک قالب، نائب حق جان عالم ہے
وجود اسکا جہاں والوں کو ظل اسم اعظم ہے

اُسے ہوتی ہے جزو و کل کی سب رمزوں سے آگاہی
جہاں میں زور امر اللہ سے کرتا ہے وہ شاہی

وہ خیمہ اپنا جب دنیا کی وسعت میں لگاتا ہے
طلسم عالم کہنہ سراسر ٹوٹ جاتا ہے

وہ اپنی فطرت معمور کا جلوہ دکھاتا ہے
نئی اسکی امنگیں ہیں، نئی دنیا بساتا ہے

جہان جزو و کل خاطر میں کیا لائے کمال اُسکا
کھلاتا ہے کئی ایسے جہاں باغ خیال اُسکا

وہ روح پختگی ہر خام کی فطرت میں بھرتا ہے
حرم کی سر زمیں کو وہ بتوں سے پاک کرتا ہے

پڑے جو ضرب اسکی، دل سے جوئے نغمہ ہو جاری
فقط حق کے لئے ہوتے ہیں اسکے خواب و بیداری

بڑھاپے کو جوانی سے وہ ہم آھنگ کرتا ھے
جواں سالی کا ھر تصویر میں وہ رنگ بھرتا ھے

بشیر نوع انساں ھے، نذیر نوع انساں ھے
سپاھی ھے، سپہگر ھے، امیر پختہ فرماں ھے

وھی ھے مدعا بس علم الا سما کا عالم میں*
وھی ھے راز سبحان الذی اسریٰ کا عالم میں†

عصا سے ھاتھ محکم ھے، ید بیضا بھی حاصل ھے‡
ھے کامل علم بھی اسکا، ملی قدرت بھی کامل ھے

---

* وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (پارہ ۱ - رکوع ۳ - البقرہ)
اور اُس نے ادم کو سب چیزوں کے نام سکھائے ۔

† سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝
(قران حکیم - پارہ ۱۵ - رکوع ۱ - سورہ بنی اسرائیل) - وہ ذات پاک ھے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لیگئی ۔ (ایۂ معراج)

‡ حضرت موسیٰ کو ید بیضا (روشن ھاتھ) کا معجزہ بارگاہ الٰہی سے عطا ھوا تھا ۔

عناں جب ہاتھ میں وہ شہسوار اسکی پکڑتا ہے
تو رہوار زمانہ کا قدم تیزی سے پڑتا ہے

سمٹ کو خشک ہو جاتا ہے دریا اسکی ہیبت سے
چھڑاتا ہے وہ اسرائیل کو قید مذلت سے*

وہ قم کہدے تو گور تن میں مردہ جان جی اٹھے
صنوبر، جیسے بنکر باغ میں نیلم پری اٹھے†

ہوئی تخلیق عالم کی کہ ہستی اسکی کامل ہو
ضمانت ہے جلال آسکا، نجات عالم کو حاصل ہو

وہ سایہ آسکا ہے ذرے کو خورشید آشنا کردے
وہ سرمایہ ہے آسکا، قیمت ہستی سوا کردے

وہ اعجاز عمل سے زندگی دیتا ہے مردوں کو
نیا انداز دیتا ہے عمل کے سب طریقوں کو

فراوانی ہے جلووں کی جہاں ہے نقش پا آسکا
طلب میں آسکے سینا کے ہیں آوارہ کئی موسیٰ

---

* حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔
† حضرت عیسیٰ کے معجزات کی طرف تلمیح ہے۔

کتاب زندگی کی وہ نئی تفسیر کرتا ہے
پرانے خواب کی گویا نئی تعبیر کرتا ہے

چھپا ہے زندگی کی تہ میں بنکر راز سر بستہ
وہ ساز زندگی کا ہے جہاں میں ان سنا نغمہ

نہ جب تک کاوش تخلیق سے فطرت کا دل خوں ہو
ہے مشکل نظم آسکی ذات کی دنیا میں موزوں ہو

بلندی میں فلک رس ہے ہماری خاک کا منصب
کہ ہے اس گرد میں اس شہسوار دھر کا مرکب

ہماری آج کی افسردہ خاکستر میں سویا ہے
وہ عالم سوز شعلہ جو ہمارا نقش فردا ہے

ہمارا غنچۂ نوخیز صد گلشن بدامن ہے
ضیائے صبح فردا سے ہماری آنکھ روشن ہے

سوار اشہب دوراں نظرآ، منتظر ہیں ہم
فروغ دیدۂ امکاں نہ تڑپا، منتظر ہیں ہم

تو آ اور رونق ہنگامۂ ایجاد ہو آکر
سواد دیدۂ مردم میں تو آباد ہو آکر

جہاں میں شورش اقوام سب خاموش ہو جائے
جو تو آئے ترا نغمہ بہشتِ گوش ہو جائے

اٹھ اور ساز اخوت چھیڑ، محفل کو جگا ساقی
مئے الفت کا جام اکبار پھر گردش میں لا ساقی

جسے ہم کھو چکے ہیں، صلح کل کی پھر وہ دولت دے
جہاں میں لڑنے والوں کو پیام صلح و الفت دے

ہے کھیتی نوع انساں اور اُس کھیتی کا حاصل تو
رواں ہے کارواں ہستی کا اور اسکی ہے منزل تو

شجر بے برگ ہیں سارے، خزاں نے یہ ستم ڈھائے
جو تو آئے تو اس اُجڑے چمن میں پھر بہار آئے

خراج ناز لے بچوں جوانوں اور بوڑھوں سے
کریں سجدے تجھے سب اپنی شرمندہ جبینوں سے

تری ہستی سے سر افراز ہیں ہم بزم عالم میں
گوارا ہے ہمیں تلخی اسی سے نظم عالم میں

شرح اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؓ

علی المرتضیٰ وہ مسلم اول شہ مردان
ہے جسکی ذات اقدس عشق کو سرمایۂ ایماں

مجھے اسکے گھرانے کی محبت زندہ رکھتی ہے
در شہوار کی صورت مجھے تابندہ رکھتی ہے

میں نرگس ہوں، بنا ہوں سر بسر میں شوق نظارہ
خیابان علی میں ہوں مثال بو میں آوارہ

اُسی سے ہے جو میری خاک سے زمزم اُبلتا ہے
اُسی سے ہے جو میرے تاک سے بادہ اچھلتا ہے

اگرچہ خاک ہوں، اُسکے کرم سے ہوں میں آئینہ
نوا جسمیں نظر آئے، مرا وہ صاف ہے سینہ

رخ انور میں اُسکے فال پیغمبر نے دیکھی تھی
اسی کی شان و شوکت سے بڑھی تھی شان مات کی

کیا مضبوط دیں کو اُسکے ہر باریک نکتے نے
جہاں کو کر دیا پابند آئیں اسکے کنبے نے

دیا تھا مرسل حق نے جو نام بو تراب اسکو
ید اللہ کہہ کے عزت دیتی ہے اُم الکتاب اسکو

سمجھتا ہے رموز زندگی کا جاننے والا
کہ کن رازوں کے حامل ہیں علی کے مختلف اسما

جسے کہکر تن خاکی یہ دنیا یاد کرتی ہے
خرد نالاں ہے اُس سے، رات دن فریاد کرتی ہے

یہی فکر فلک رس کو بناتا ہے زمیں پیما
ہیں اہل گوش بہرے اس سے، دیدہ ور ہیں نابینا

ہوس کی، ہاتھ میں رکھتا ہے یہ تلوار دو دھاری
لگاتا ہے یہ رہزن رہرووں کو دل کی بیمادی

تن خاکی کے خیبر کو کیا تسخیر حیدر نے
اسی بے نور مٹی کو کیا اکسیر حیدر نے

علی تلوار نے جسکی جہاں میں حق کو چمکایا
ہؤا جب فاتح تن، بو تراب اسوقت کہلایا

وہ کشور گیر ہوتا ہے جسے حاصل ہو کراری
چمکتا ہے گہر اُسکا جسے ملجائے خودداری

جو کوئی عالم امکاں میں بنکر بو تراب آئے
اگر چاھے تو وہ خورشید کو مغرب سے لوٹائے*

جو زیں مضبوط کرکے مرکب تن پر لگاتا ھے
جگہ مثل نگیں وہ خاتم دولت میں پاتا ھے

یہاں پر چومتی ھے اسکے پاؤں شان خیبر کی
وھاں ھوگی اُسی کے ھاتھ میں تقسیم کوثر کی

خود آگاھی سے ھوتی ھے یداللہی اُسے حاصل
یداللہی سے ھوتی ھے شہنشاھی اُسے حاصل

وہ ھے علم و ھنر کے شہر کا دنیا میں دروازہ
جہاں میں ھر طرف اسکی حکومت کا ھے آوازہ†

جو اپنے تاک سے ھو بادۂ روشن کا متلاشی
کرے وہ زیر فرماں پہلے اپنا پیکر خاکی

---

* تلیمع ھے معجزۂ رجعت خورشید کی طرف۔

† اَنَامَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا (حدیث)

سراپا خاک ہو جانا ہے دین و کیش پروانہ
حکومت خاک پر کرنا مگر ہے کام مردانہ*

تو اے جو مثل گل نازک بدن ہے، سنگ خارا ہو
تری بنیاد دیوار چمن کا تب سہارا ہو

کر اپنی خاک سے تعمیر پہلے ایک آدم کی
پھر اُس آدم کی خاطر رکھ بنا اک، اور عالم کی

بنا سکتا نہیں ہے تو اگر دیوار و در کوئی
بنا لیگا تری مٹی سے اینٹیں اور گھر کوئی

تجھے پیر فلک سے اپنی بدبختی کا شکوہ ہے
ترے ساغر کو سنگ و خشت کی سختی کا شکوہ ہے

یہ کب تک ماتم و فریاد و آہ و نالہ و شیون
یہ کب تک دلفگاری، سینہ کوبی، شکوۂ دشمن

عمل کی گرمجوشی میں چھپا مضمون ہستی ہے
ملے تخلیق میں لذت، یہی قانون ہستی ہے

* حضرت علی مرتضیٰ کی کنیت ابو تراب (یعنی مٹی کا باپ) کی طرف اشارہ ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ انہیں اپنے نفس پر پورا قابو تھا۔

اٹھ اپنے دست و بازو سے جہان تازہ پیدا کر
خلیل اللہ کی صورت بنا شعلوں میں اپنا گھر

جہان بے سعادت سے ترا ہم رنگ ہو جانا
سپر کو پھینک کر میداں میں ہے بے ننگ ہو جانا

اگر خوددار ہے کوئی، جنوں ہے پختہ کار آسکا
تو لازم ہے کہ ہو جائے زمانہ سازگار آسکا

زمانہ گر نہیں ہوتا موافق اسکی فطرت کے
فلک سے جنگ کا اعلان کرتا ہے وہ ہمت سے

ہلا دیتا ہے بنیادیں وہ موجودات کی آخر
نئی صورت بنالیتا ہے وہ ذرات کی آخر

وہ کرتا ہے نظام گردش ایام کو برہم
وہ کرتا ہے مدار چرخ نیلی فام کو برہم

وہ تنہا اپنی قوت سے جہان نو بناتا ہے
جو چلتا ہے آسی رستے پہ جس پر وہ چلاتا ہے

نہ ہو ممکن اگر دنیا میں مردوں کی طرح جینا
تو مردوں کی طرح مرنا، ہے جام زندگی پینا

جو صاحبد ل ھے، خطروں کو وہ کب خاطر میں لاتا ھے
مہموں سے وہ ٹکر لے کے 'قوت آزماتا ھے

وھی ھے عشق کے شایاں ملے جو جان جوکھوں سے
خلیل اللہ نے جیسے چنے تھے پھول شعلوں سے

عیار سرد ھم مشکل پسندی مان سکتے ھیں
وہ کتنے پانیوں میں ھے، یہ اس سے جان سکتے ھیں

نہیں ھے پست ھمت کا کوئی حربہ بجز کینہ
مگر ھے زندگی کا ایک ھی آئین آئینہ

حیات اک قوت ظاھر ھے، گن قوت کے گاتی ھے
ھے ذوق غلبہ اصل اسکی، یہ اسکو آزماتی ھے

ھے بیجا عفو، خون زندگی کا سرد ھو جانا
یہ ھے سکتے کا شعر زندگی میں جان کر لانا

مذلت کے گڑھے میں جو کوئی بے چارہ رھتا ھے
قناعت، ناتوانی کو وہ دھوکا کھا کے کہتا ھے

رہ ھستی میں رھزن، ناتوانی آ کے بنتی ھے
یہ وہ ماں ھے، جو خوف اور جھوٹ کے بچے ھی جنتی ھے

نہیں ہے قلب میں اسکے کوئی خوبی کوئی نیکی
جہاں میں دودھ پر اسکے ہیں بدیاں پھولتی پھلتی

جو دانا ہے وہ اس موذی سے پہلو کو بچاتا ہے
یہ وہ دشمن ہے چھپ کر گھات میں جو بیٹھ جاتا ہے

اگر ہو صاحب عقل و خرد، کھانا نہ تم دھوکا
بدل لیتی ہے رنگ اپنا یہ پل میں صورت حربا*

نہیں اہل نظر بھی شکل اسکی جانتے اکثر
کہ پردے ڈالتے رہتے ہیں وہ خود اسکے چہرے پر

کبھی رحم اور کبھی نرمی ہے اسکی پردہ دار آئی
چھپائے رخ کبھی اسکا ردائے انکسار آئی

کبھی ملبوس مجبوری میں وہ مستور آتی ہے
کبھی وہ چھپ کے معذوری کی تہ میں بیٹھ جاتی ہے

کبھی شکل تن آسانی میں چہرہ آ دکھاتی ہے
یہ ہاتھوں ہاتھ انسان قوی کا دل اڑاتی ہے

---

* حربا ایک جانور ہے جو وقتاً فوقتاً اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

صداقت دھر میں ھوتی ھے ھمزاد توانائی
یہی ھے جام جم، حاصل ھوگر تجھکو خود آگاھی

یہاں کی زندگی کھیتی ھے، قوت اسکا حاصل ھے
کھلا دنیا میں قوت ھی سے راز حق و باطل ھے

اگر ھو مدعی کے ھاتھ میں سرمایہ قوت کا
تو دعویٰ اسکا ھوتا ھی نہیں محتاج حجت کا

دکھاتا شان حق ھے جھوٹ، قوت کی مدد پاکر
وہ خود کو حق سمجھ لیتا ھے آخر حق کو جھٹلا کر

اگر وہ کن کہے تو زھر کوثر بن ھی جاتا ھے
جو کہدے خیر کو 'تو شر ھے' وہ شر بن ھی جاتا ھے

بتاتا ھوں تجھے میں رمز آداب امانت کی*
دو عالم سے تو اپنے آپ کو بہتر سمجھ کر جی!

---

* یعنی خلافت الہیہ۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (پارہ ۲۲۔ رکوع ۹۔ احزاب)

ھم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمینوں پر پیش کیا تو انھوں نے اسکو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسکو اٹھا لیا۔ تاعقیق وہ ظالم اور جاھل تھا۔

رموز زندگی سے واقفیت تبری کامل ہو
جو غیر اللہ سے ہو جنگ، تو ظالم ہو جاہل ہو

یہ شرط ہوشمندی ہے کہ چشم و گوش و لب ہوں وا
نہ پائے پھر بھی راہ حق تو جائز تیرا استہزا!

نوجوان مروی کی حکایت

وہ مخدوم جہاں، وہ سید ہجویر والا جاہ
تھی جسکی پاک تربت پیر سنجر کو زیارت گاہ*

وہ آسانی سے کہساروں کے پشتے توڑ کر آیا
زمین ہند میں بونے کو تخم سجدہ وہ لایا

اُسی نے عہد فاروقی یہاں پیدا کیا پھر سے
بیاں نے اُس کے حق کا بول بالا کر دیا پھر سے

---

* پیر سنجر۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت ہجویری کے مزار واقع لاہور کے زائر بنے۔ حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔

دیار ھند میں تھا عزت قرآں کا رکھوالا
نگہ سے آسنے باطل کے گھروندے کو آلٹ ڈالا

کیا ھر سانس سے اس نے گل پنجاب کو زندہ
ھوئی خورشید سے اسکے ھماری صبح تابندہ

وہ عاشق تھا، جہاں میں عشق کا پیغام لایا تھا
جبیں سے آسکی سر عشق اھل دل نے پایا تھا

سناتا ھوں تمھیں اک داستاں آس مرد کامل کی
کلی میں بند کرتا ھوں میں اک گلشن کی رنگینی

دیار مرو سے لاھور میں اک نوجواں آیا
تھی قامت کی بلندی کہہ رھی، سرو رواں آیا

حضور سید والا وہ پہنچا آرزو لیکر
کہ جلوہ ریز ھو خورشید انور آسکی ظلمت پر

کہا یوں: ”دشمنوں نے مجھکو چاروں سمت گھیرا ھے
ھے بارش پتھروں کی، درمیاں میں میرا ڈیرا ھے

شہ گردوں مکاں! مجھکو بتائیں آپ گر ایسا
کہ ممکن ھو سکے اعدا کے نرغے میں مرا جینا“

کہا یوں پیر دانا نے کہ جسکی ذات میں باھم
جمالی اور جلالی شان میں تھا رابطہ محکم

"نہیں معلوم راز زندگی اے کم نظر تجھکو
نہیں آغاز اور انجام کی اسکے خبر تجھکو

نہ اپنے دل پہ ھونے دے کبھی غیروں کا ڈر طاری
تو اک خوابیدہ قوت ھے، تجھے لازم ھے بیداری

گماں گذرا جو پتھر کو کہ وہ شیشے کی صورت ھے
تو وہ شیشہ ھؤا اور ٹوٹنا شیشے کی فطرت ھے

جو اپنے آپ کو رھرو ضعیف و ناتواں سمجھے
تو پھر رھزن کی ملکیت وہ اپنا نقد جاں سمجھے

رھے کیوں اپنی نظروں میں تو خاک و آب کا پتلا
کر اپنی خاک کے ذروں سے شعلہ طور کا پیدا

عزیزوں سے یہ تیری سر گرانی بے محل سی ھے
عدو کی دشمنی کی یہ کہانی بے محل سی ھے

حقیقت کو اگر دیکھیں تو دشمن دوست ھے تیرا
ترے بازار کی رونق کا باعث ھے وجود آسکا

سمجھتا ہے مقامات خودی پہچاننے والا
ہے فضل حق، قوی دشمن سے گر اسکو پڑے پالا

عدو ہے کشت انساں کے لئے جوں ابر آذاری
جگا دیتا ہے اسکی ممکنات خفتہ وہ ساری

بلندی ہو جو ہمت میں تو سنگ رہ بھی پانی ہو
بلند و پست کیا ہیں، سیل کی جس جا روانی ہو ؟

فساں ہوتا ہے سنگ راہ، تیغ عزم انساں کو
پرکھتے قطع منزل سے ہیں اس شمشیر براں کو

جو حیوانوں سا جینا ہو تو پھر کس کام کا جینا
نہ ہو محکم خودی جب تک، تو ہے بس نام کا جینا

خودی سے تو جو اپنے آپ کو پہلے کرے محکم
اگر چاہے تو کر سکتا ہے پھر بزم جہاں برہم

فنا چاہے تو آساں ہے، خودی سے بے خبر ہوجا
بقا چاہے تو اقرار خودی میں پختہ تر ہوجا

حقیقی موت ہے غافل خودی کا ہاتھ سے کھونا
تری نظروں میں ہے یہ جان کا تن سے جدا ہونا

خودی میں کر مقام اپنا مثال یوسف کنعاں
اسیری کو بدلنا پادشاهی سے هے پھر آساں

خودی کو رهنما کر، بن کے مرد کار عالم میں
تو هو جا مرد حق اور حامل اسرار عالم میں

آٹھاتا هوں کہانی کہہ کے روئے راز سے پردہ
شگفتہ اک نفس کے زور سے کرتا هوں میں غنچہ

جہاں کیف جو پوشیدہ سر دلبراں میں هے*
نہاں لطف بیاں آسکا، حدیث دیگراں میں هے"

---

* مثنوی مولانائے روم کا شعر هے:
خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

پیاسا پرندہ

لگی پیاس اک پرندے کو تھی ایسی، چہچہے بھولا
زباں تھی چونچ سے باھر ، گلا تھا خشک، دم پھولا

نظر آیا اُسے اک باغ میں الماس کا ریزہ
دکھایا تشنگی نے آنکھ کو پانی کا نظارہ

چمک خورشید کی بخشی تھی کرنوں نے وہ ذرے کو
ھؤا پانی کا پتھر پر گماں بھولے پرندے کو

لگائی ٹھونگ طائر نے، نہ منہ میں کچھ نمی آئی
تھی پختہ فطرت گوھر، نہ اس میں کچھ کمی آئی

کہا الماس نے اُس سے، گرفتار ھوس ھے تو
کہ آیا تیز کرکے مجھ پہ منقار ھوس ھے تو

نہ میں قطرہ ھوں پانی کا، نہ میں تیرے لئے ساقی
نہ میں دنیا کی محفل میں ھوں غیروں کے لئے باقی

اگر ھے درپئے آزار میرے، تو ھے دیوانہ
حیات خود نما کی صورتوں سے تو ھے بیگانہ

وہ مجھ میں آب ہے، منقار جس سے مرغ کھو بیٹھے
نگل کر جسکو انساں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے

نہ پایا مدعا دل کا پرندے نے جو ہیرے سے
چلا منہ موڑ کر تا بندہ گوہر سے وہ دھیرے سے

ہوئی آباد حسرت آسکے سینے میں، فضا بدلی
گلوئے خشک میں فریاد سے اسکی نوا بدلی

سرے پر شاخ گل کے اوس کا قطرہ تھا یوں لٹکا
ہو جیسے دیدۂ بلبل میں موتی اشک کا اٹکا

چمک آسکی شعاع مہر کی شرمندۂ احساں
تن نازک تھا اسکا خوف سے خورشید کے لرزاں

وہ کوکب آسماں زادہ، وہ خوئے رم کا دلدادہ
ہؤا ذوق نمائش سے تھا پل بھر کو وہ استادہ

وہ جس نے آب و رنگ گل سے دھوکا بارہا کھایا
نہ جس نے زندگانی سے کوئی حصہ کبھی پایا

وہ گرنے پر تھا آمادہ مثال اشک داماں میں
غم دل نے پرویا ہو جسے عاشق کی مژگاں میں

آسی ڈالی کے نیچے طائر مضطر بھی آپہنچا
ذرا جھک کر دھن کھولا تو قطرہ اوس کا ٹپکا

تو اے جو چاہتا ہے دشمنوں کا دور ہو خطرہ
بتادے مجھکو یہ پہلے کہ تو گوہر ہے یا قطرہ

بنی جب پیاس کی شدت سے آکر جان طائر پر
رہا زندوں کی دنیا میں کسی کی جان وہ لیکر

نہ قطرے میں تھی کچھ سختی، نہ تھی ہیرے کی خو پائی
رہا الماس باقی اور قطرے کی قضا آئی

خودی کی پاسداری کر، کبھی غافل نہ دم بھر ہو
نہ بن تو قطرۂ شبنم، جو جینا ہے تو گوہر ہو

مثال کوہساراں پختہ ہو جا اپنی فطرت میں
رہیں صد ابر دریا بار پھر تیری رفاقت میں

تو اپنا آپ پا جائے خودی میں گر تو کھو جائے
اگر سیماب تھا پہلے تو سیم ناب ہو جائے

ہلا کر تار تو ساز خودی کے، نغمہ پیدا کر
اٹھا اسرار سے پردے، خودی کا رخ ہویدا کر

ہیرا اور کوئلہ

میں پھر باب حقیقت کھول کر تجھ کو دکھاتا ہوں
تجھے اے ہم نشیں اک اور قصہ میں سناتا ہوں

کہا یوں کوئلے نے ایکدن ہیرے سے معدن میں
چمکتا ہے ابد کا نور تیرے روئے روشن میں

ہیں یار غار ہم اور ایک سی ہستی ہماری ہے
بدن دو ہیں مگر اک روح ہم دونوں میں ساری ہے

میں ناکس ہوں، یہ غم معدن میں مجھکو کھائے جاتا ہے
مگر تو تاج شاہی پر جگہ اپنی بناتا ہے

وہ بد گل ہوں، سمجھتے خاک سے کمتر ہیں سب مجھکو
جو آئینے کا دل توڑے جمال ایسا ملا تجھکو

سیہ رو ہوں۔ مرا کیا کام ہے؟۔گلخن کو دہکانا!۔
مرے جوہر کی ہے معراج جل کر راکھ ہوجانا

مرا سر توڑ دیتے ہیں کچل کر پاؤں سے سارے
متاع زیست پر میری بجھا دیتے ہیں انگارے

مجھے اپنے سروساماں پہ اکثر رونا آتا ہے
مری ہستی کا سرمایہ، تجھے معلوم ہے کیا ہے؟

میں لہراتا دھؤاں ہوں جو بہم مل جل کے جم جائے
مری دولت شرر ہے ایک جو بس اڑ کے تھم جائے

ترے چہرے، تری خو میں ہے انجم کی درخشانی
ترے ہر ایک پہلو میں ہے جلووں کی فراوانی

کبھی تو قصر شاہی میں ہے نور دیدۂ قیصر
کبھی پاتا ہے تجھ سے زیب و زینت دستۂ خنجر

کہا ہیرے نے: سن ہمدم! نصیحت کا یہ موتی ہے
سیہ مٹی نگیں بنتی ہے جب وہ پختہ ہوتی ہے

وہ جب اپنے حوالی سے دما دم جنگ کرتی ہے
تو اپنے آپ کو پختہ مثال سنگ کرتی ہے

ملا ہے مجھکو فیض پختگی سے نور کا پیکر
مرے سینے میں لہریں لے رہا جلووں کا ہے ساگر

ہؤا ہے خوار تو اپنے وجود خام کے باعث
تو جل کر رہ گیا ہے نرمئی اندام کے باعث

گنوا مت دولت جاں، خوف میں، وسواس میں، غم میں
مثال سنگ پختہ ہو، تو بن الماس عالم میں

ہو جسکی سخت کوشی سخت گیری بن چکی فطرت
د و عالم کو عطا کرتی ہے نور اُس شوخ کی طلعت

یہ ہے تو خاک لیکن سنگ اسود ہم کو پیارا ہے
حرم کی سر زمیں میں جس نے سر کو جا اُبھارا ہے

ملا ہے طور سینا سے بھی رتبہ اُسکو بالا تر
وہ کعبہ میں بنا ہے بوسہ گاہ اسود و احمر

صلابت سے جہاں میں آبروئے زندگانی ہے
اثر ناپختگی کا ناکسی اور ناتوانی ہے!

حکایتِ شیخ و برہمن

بنارس میں تھا اک پنڈت ، بڑا تھا احترام اُسکا
ھیں مرگ و زیست کیا؟ اس سوچ میں رھنا تھا کام اُسکا

ملا تھا بہرہ وافر اسکو علم و فضل و حکمت سے
خدا کو ڈھونڈنے والوں سے ملتا تھا ارادت سے

رسا تھا ذھن اُسکا اور نئی باتوں کا رسیا تھا
جہان عقل و دانش میں وہ ھمدوش ثریا تھا

بلندی پر تھا اُسکا آشیانہ صورت عنقا
جلا سکتا تھا مہرومہ کو فکر آتشیں اُسکا

پسینہ خون اُس نے ایک کر ڈالا تھا مدت سے
مگر جام اُسکا خالی ھی رھا صہبائے حکمت سے

بہت علم و خرد کے باغ میں دام اُسنے پھیلایا
رھیں آنکھیں کھلی اور طائر معنی نہ ھاتھ آیا

ھؤا تھا ناخن فکر اُسکا رنگیں خون کاوش سے
حیات و مرگ کا عقدہ کھلا لیکن نہ کوشش سے

پتہ دیتی تھی آسکی آہ اسکے سوز حرماں کا
بنا غماز اسکا چہرہ اسکے قلب حیراں کا

ہؤا حاضر وہ اکدن آستان شیخ کامل پر
خزینہ دل کی دولت کا تھا جسکا سینۂ انور

سنی تقریر آسنے گوش دل سے مرد دانا کی
لگالی اپنے ہونٹوں پر مگر خود مہر خاموشی

کہا یوں شیخ نے: اے آسماں پر گھومنے والے
یہ بہتر ہے تو کچھ دن خاک سے طرح وفا ڈالے

پھرا تو دشت و صحرا میں چراغ آرزو لیکر
تھی تیرے فکر کی دنیا ستاروں سے بلندی پر

فلک پر آڑنے والے! پھر زمیں سے تو بنا اپنی
نہ ڈھونڈے سے ملینگے تجھکو تاروں کے کبھی موتی

میں تجھ سے یہ نہیں کہتا بتوں کی چھوڑ دے پوجا
مگر زنار کے شایاں تو ہو، کافر ہے گر رہنا*

---

* متبادل ترجمہ یوں بھی ہؤا تھا:—
میں تجھ سے یہ نہیں کہتا بتوں سے تو کنارہ کر
جو کافر ہے تو بن زنار کے شایاں اے نکتہ ور

ملی ہے تجھکو تہذیب کہن، یہ اک امانت ہے
نہ مسلک چھوڑ آبا کا، اسی میں تیری عظمت ہے

اگر ہے زندگی ملت کی جمعیت سے وابستہ
نہ ہو کیوں کفر بھی دنیا میں جمعیت کا سرمایہ

جو ابتک کافری میں بھی نہیں تو ہوسکا کامل
طواف کعبۂ دل کے تو ہوگا کس طرح قابل

دیا ہے چھوڑ ہم دونوں نے ہی تسلیم کا رستہ
تو بھولا ہے رہ آذر، میں ابراہیم کا رستہ

نہ اپنا قیس ابتک ہوسکا سودائی محمل
جنون عاشقی میں ہوسکا ابتک نہ یہ کامل

ہوئی خاموش جب شمع خودی تن کے شبستاں میں
ملیگا کیا خیال آسماں پیما کے طوفاں میں

بڑھا کر ہاتھ پکڑا دامن کسہار پانی نے
ہمالہ سے کہا اکدن یہ گنگا کی روانی نے

ہے یخ کا تاج صبح آفرینش سے ترے سر پر
تجھے زنار پہنائے ہیں دریاؤں نے بل کھا کر

تو ہے افلاک کا محرم، بلندی مل گئی تجھکو
خرام ناز کی قدرت مگر حق نے نہ دی تجھکو

ترے قدموں سے جب چھینی گئی رفتار کی طاقت
تو لاحاصل، ہیں تمکین و وقار و شوکت و رفعت

جہاں میں چلتے رہنا، چلتے رہنا، زندگانی ہے
نہیں گر موج میں رم، موج اک بھولی کہانی ہے

سنا جب کوہ نے دریا سے یہ طعنہ تو وہ بگڑا
سمندر آگ کا گویا بھڑک اٹھا، وہ یوں بپھرا

کہا یوں: تیرے پانی کی ہے وسعت میرا آئینہ
مگر رکھتا ہے تجھ ایسے کئی دریا مرا سینہ

خرام ناز تیرا کیا ہے؟ یہ مٹنے کا ساماں ہے
کیا جس نے خودی کو ترک، بس مٹنے کے شایاں ہے

نہیں اپنے مقام و مرتبہ کی کچھ خبر تجھکو
زیاں اپنے پہ فخر و ناز ہے اے بے خبر تجھکو

جنم تو نے لیا آکاش سے، یہ لوگ کہتے ہیں
وہ ساحل تجھ سے بہتر ہیں جو ٹوٹے پھوٹے رہتے ہیں

سمندر کو جو تو نے نذر کردی زندگی اپنی
تو خود ھی بخش دی رھزن کو نقدی جان کی اپنی

چمن میں پھول کی مانند خود داری میں ھو پختہ
تو خوشبو اپنی پھیلانے کو گلچیں کا نہ کر پیچھا

یہی ھے زندگی، اپنے ٹھکانے پر نمو پانا
خیابان خودی سے پھول چن کر رنگ و بو پانا

کئی صدیوں سے میرے پاؤں میں اٹکی ھے یہ مٹی
تجھے کیا یہ گماں ھے، دور ھوں منزل سے میں اپنی؟

بڑھا میں اور بام آسماں سے جا کے ٹکرایا
مرے دامن میں خود جھمکا ثریا کا چلا آیا

سمندر میں جو تو پہنچا تو گم تیرے کنارے ھیں
مری چوٹی وہ ھے سجدے جہاں کرتے ستارے ھیں

نہیں پوشیدہ مجھ سے جو نہاں ھے آسمانوں میں
صدا آتی ھے پرواز ملک کی میرے کانوں میں

جلایا میں نے تن من کوشش پیہم کی بھٹی میں
ھوئے تب گوھر و الماس پیدا میری مٹی میں

مرے اندر ھے پتھر اور پتھر میں چھپی آتش
گذر پانی کا جس تک ھو نہیں سکتا، وھی آتش

جو تو قطرہ ھے، دیکھ اپنے ھی قدموں پر نہ تو برسے
آٹھا طوفاں، تڑپ پیہم، آلجھ جا تو سمندر سے

طلب کر آب گوھر اور بن جا تو گہر ریزہ
کسی محبوب کے تو گوش نازک کا ھو آویزہ

آبھر کر، پھیل کر، چھاجا ! سبک رفتار ھو کر چل!
جو برق انداز و دریا بار ھو، بن جا تو وہ بادل!

تجھی سے بھیک مانگے پھر سمندر موج و طوفاں کی
آسے ھو باعث شکوہ خود اپنی تنگ دامانی

تب اپنے آپ کو اک موج سے کمتر وہ گردانے
ترے قدموں میں آ بیٹھے، تجھے اپنا گرو جانے

جہاد کا مقصد

خدائی رنگ سے رنگین اپنا قلب سادہ کر
تجھے گر عشق کی ناموس کا ہے پاس ذرہ بھر*

جہاں میں طبع مسلم عشق سے بے باک و قاہر ہے
مسلماں گر نہیں عاشق تو وہ زندیق و کافر ہے

کھلی ہوں، بند ہوں آنکھیں، وہ ہر دم حق کے تابع ہے
وہ کھانے، پینے، سونے میں بھی پیہم حق کے تابع ہے

رضائے حق ہو گم جس میں، وہ ہوتی ہے رضا اسکی
یقیں اہل جہاں کیسے کریں، ہے بات ہی ایسی

وہ الا اللہ کے میدان میں خیمہ لگاتا ہے
وہ شاہد ہو کے لوگوں پر بھری دنیا میں آتا ہے

شہادت اسکی دیتا ہے خدا کا پاک پیغمبر
نہیں ہے شاہدوں میں جس سے شاہد کوئی صادق تر

---

* وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ط (پارہ اول سورۃ البقرۃ) ۔ اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے۔

گذر جا قال سے اور حال کے در پر صدا دے تو
عمل کی ظلمتوں کو نور حق سے جگمگا دے تو

قبائے خسروی میں رہ، مگر درویش ہو کر جی
تری آنکھوں میں بیداری ہو، دل میں یاد خالق کی

ترے ہر فعل کا مقصود قرب حق ہو دوراں میں
جلال آسکا ہو تجھ سے آشکارا بزم امکاں میں

نہیں ہے صلح شر سے کم، جو ہو مقصود غیر آسکا
غرض گر جنگ کی ہو حق، تو ہے اقدام خیر آسکا

ہماری تیغ سے جب تک نہ حق کا بول ہو بالا
نہیں عزت کا باعث قوم کو جنگ آزما ہونا

میاں میر ولی اللہ، خاص و عام کے پیارے
وہ جن کے نور جاں سے تھے عیاں سر نہاں سارے

طریق مصطفیٰ پر آپ پابندی سے چلتے تھے
وہ نے تھے جس سے نغمے عشق و الفت کے نکلتے تھے

ہمارے شہر کو وجہ سعادت آن کی تربت ہے
ہمارے واسطے وہ مشعل نور ہدایت ہے

جہاں جھکتا تھا گردوں، وہ تھا سنگ آستاں اُنکا
مرید با ارادت تھا شہ ہندوستاں اُنکا

ہوس کے بیج شہ نے دل میں بوئے تھے، وہ پھوٹ آئے
تھی نیت اُسکی ملک غیر کو زیر نگیں لائے

وہ آتش حرص کی سینے کی بھٹی میں تھا بھڑکاتا
"کوئی ہے اور؟" کا نعرہ تھا تیغ اپنی کو سکھلاتا*

دکن کا ملک اُن ایام میں ہنگامہ پرور تھا
گیا جنگ آزما ہونے وہاں سلطاں کا لشکر تھا

جناب شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گیا سلطاں
کہ اپنی کامیابی کا دعا سے وہ کرے ساماں

مسلماں دوڑ کر دنیا سے حق کی سمت جاتا ہے
دعا سے اپنی ہر تدبیر کو محکم بناتا ہے

تھا شہ طالب دعا کا، شیخ پر خاموش بیٹھے تھے
سبھی درویش حلقے کے سراپا گوش بیٹھے تھے

---

* يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۵ (پارہ ۲۶۔ ق)
اُس دن ہم دوزخ سے پوچھینگے کہ کیا تو بھر گئی؟ وہ کہیگی کہ کچھ اور بھی ہے؟

لئے مٹھی میں اک چاندی کا سکہ اک مرید آیا
ادب سے بڑھکے اُس نے مہر خاموشی کو یوں توڑا

"اے گمراھوں کے رھبر! مجھ پہ ھو الطاف شاھانہ
قبولیت اگر پائے مرا ناچیز نذرانہ

رھا ھے غرق محنت کے پسینے میں یہ تن میرا
ھؤا تب جاکے اک درھم بصد رنج و محن میرا"

کہا یوں شیخ نے اس زر پہ افضل حق ھے سلطاں کا
جو ھے ملبوس شاھی میں گدائے بے نوا گویا

ھیں مہر و ماہ و انجم گرچہ اُسکے تابع فرماں
ھمارا بادشہ دنیا میں ھے مفلس ترین انساں

جمی ھیں اُسکی نظریں دوسروں کے خوان پر پیہم
جلا ڈالا ھے اُسکی بھوک کے شعلوں نے اک عالم

برستے قحط اور طاعون ھیں شمشیر سے اُسکی
جہاں سارا ھے ویرانہ بنا تعمیر سے اُسکی

بنایا اُسکی ناداری نے دنیا بھر کو فریادی
ھوئی اُسکی تہی دستی سے کمزوروں کی بربادی

عروج و اقتدار اسکا جہاں والوں کا دشمن ہے
اگر ہے نوع انساں کارواں، وہ اسکا رہزن ہے

وہ مست خود فریبی، محو فکر خام رہتا ہے
وہ نادانی سے اپنی لوٹ کو تسخیر کہتا ہے

ہمارے شہ کا لشکر ہو کہ ہوں افواج دشمن کی
ہیں اسکی بھوک کی تلوار سے دو نیم دونوں ہی

گدا کی بھوک تو جان گدا ہی کو جلاتی ہے
مگر جوع سلاطیں ملک و ملت کو مٹاتی ہے

اٹھائے گر کوئی تلوار غیر اللہ کی خاطر
اُسی کے سینے میں پیوست ہو جاتی ہے وہ آخر

بابائے صحرائی کی نصیحت *

تو اے جو پھول کی مانند مٹی سے پھلا پھولا
ہؤا بطن خودی سے تو ریاض دھر میں پیدا

نہ کر ترک خودی ہرگز، بقا انجام ہو کر رہ
جو قطرہ ہوکے رہنا ہے تو بحر آشام ہو کر رہ

خودی کے نور سے ہوتی ہے ہستی تیری تابندہ
خودی محکم اگر کر لے تو ہو جائے تو پائندہ

یہ سودا فائدے کا ہے، نہ اس سودے سے ہو غافل
یہ وہ دولت ہے جس سے تجھ کو ہوگی خواجگی حاصل

اگر زندہ ہے تو، کیوں نیستی سے ڈرتا رہتا ہے
ترے قرباں غلط سمجھا ہے تو جو کچھ بھی سمجھا ہے

---

* ڈاکٹر نکلسن کا خیال ہے کہ "بابائے صحرائی" کے پردہ میں خود علامہ اقبال جلوہ گر ہیں - یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے -

حقیقت مجھ پہ روشن ہے کہ ساز زندگی کیا ہے
ادھر آ میں بتاؤں تجھکو راز زندگی کیا ہے

خود اپنے آپ ہی میں غوطہ زن مثل گہر ہونا
ابھر کر اپنی خلوت گاہ سے آتش نظر ہونا

دبی چنگاریوں کو راکھ کی ڈھیری میں بھڑکانا
جو نظروں کو جلا دے ایسا شعلہ زار بن جانا

چہل سالہ مصیبت کا گھروندا پھونک کر رکھدے
تو بن کر شعلۂ جوالہ اپنے گرد چکر لے

جو طوف غیر ہی کو موت گردانے، وہ زندہ ہے
وجود اپنے کو جو بیت الحرم جانے، وہ زندہ ہے

پروں کو پھڑ پھڑا کر تو نکل مٹی کے پھندے سے
پرندوں کی طرح محفوظ ہو گرنے کے خدشے سے

اگر طائر نہیں ہے تو، نہ کر پھر امتحاں اپنا
دھان غار پر ہرگز بنا مت آشیاں اپنا

تری خواہش ہے باغ علم کے سب پھول تو چن لے
پیام پیر رومی گوش دل سے تو مگر سن لے

نہیں افعی سے کم وہ علم جو بس تن کے کام آئے
ترا ہمدم بنیگا علم اگر وہ دل کو گرمائے*

تجھے معلوم ہے یہ داستاں آستاد رومی کی
کہ جس کی درسگہ شہر حلب میں علم پرور تھی

پڑی عقلی دلیلوں کی تھی بیڑی اسکے پاؤں پر
پھنسی تھی اسکی کشتی عقل کے گرداب میں آکر

وہ موسیٰ تھا مگر بیگانہ سینائے محبت سے
نہ اسکو عشق سے مس تھا نہ سودائے محبت سے

تشکک† پر کبھی اشراق‡ پر اصرار ہوتا تھا
ہر اک موضوع پر حکمت کے موتی وہ پروتا تھا

وہ سلجھاتا تھا اکثر قول مشائین¶ کے عقدے
اجاگر اسکے نور فکر سے اسرار تھے سارے

---

* مولانائے روم:
علم را برتن زنی مارے شود   علم را بر دل زنی یارے شود

† ‡ ¶ قدیم فلسفہ یونان کے مختلف دبستان۔ انگریزی میں تشکیک کو Scepticism ۔ اشراق کو Neoplatonism اور مشائین کو peripatetics کہتے ہیں ۔ فلسفہ اشراق سے اسلامی تصوف بہت حد تک اثر پذیر ہے ۔ اسکے علمبردار (باقی صفحہ ۱۰۳ پر)

کتابوں کے ذخیروں میں سدا محصور رہتا تھا
نشے میں شرح اسرار کتب کے چور رہتا تھا

اشارہ ہوگیا جب پیر تبریزی* کو مرشد کا
جلال الدین† کے مکتب کا آسنے رخ کیا سیدھا

کہا یہ شور و غوغا اور یہ قیل و قال کیسے ہیں ؟
خدا را یہ قیاس و وہم و استدلال کیسے ہیں ؟

کہا یوں مولوی نے ڈانٹ کر: ''خاموش اے نادان
خرد مندوں کی باتوں پر ہنسی تجھکو نہیں شایاں

پرے ہٹ ، دور ہو جا میرے مکتب سے او دیوانے
ترا کیا کام ہے اس سے، تو قیل و قال کیا جانے ؟

ہماری گفتگو تیری سمجھ کی حد سے باہر ہے
اسی کے نور سے ادراک کا شیشہ منور ہے''

(صفحہ ۱۰۲ سے آگے) مسلمانوں میں شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول تھے جو سلطان صلاح الدین کے حکم سے علمائے وقت کے فتویٰ پر قتل کئے گئے ۔ حکماء مشائین ارسطو کے پیرو ہیں ۔

* شمس تبریزی اپنے پیر و مرشد بابا کمال الدین جندی سے اشارہ پا کر مولانا روم کے پاس گئے تھے ۔

† مولانا جلال الدین رومی ۔

بڑھایا سوز شمس ان بے طرح باتوں نے ملا کی
بھڑک اٹھی غضب کی آگ سے تب روح تبریزی

زمیں پر اسکی نظروں نے گرائے برق کے پارے
نمایاں اسکے سوز دم سے مٹی میں ہوئے شعلے

جلا یا خرمن ادراک یکسر دل کی آتش نے
کیا سب فلسفے کا پاک دفتر دل کی آتش نے

وہ ملا عشق کے اعجاز سے واقف نہ تھا ابتک
وہ ساز عشق کے نغموں سے تھا نا آشنا ابتک

پکار اٹھا: ''یہ شعلہ کس طرح بھڑکا دیا تونے
کہ جس سے دفتر حکمت کو خاکستر کیا تونے''

کہا یوں شیخ نے: ہے مسلم زنار بستہ تو
یہ ذوق و حال ہے، خاموش رہ، لے اپنا رستہ تو

ترے فکر و تخیل سے ہمارا حال بالا ہے
جو بس کو زر کرے وہ کیمیا شعلہ ہمارا ہے

ترے سرمایہ کو ہے برف حکمت سے ملا کس بل
فقط اولے ہی برساتا ہے تیرے فکر کا بادل

اُٹھ اپنے ھی خس و خاشاک سے آتش فروزاں کر
تو اپنی خاک کے ھر ذرہ کو شعلہ بد اماں کر

نہ ھوگر سوز دل، مسلم نہیں ھے علم میں کامل
یہی ھے معنئی اسلام، تو ھو تارک آفل*

جو ابراھیم نے پائی رھائی بند آفل سے
نہ اسکا بال بیکا کر سکے نمرود کے شعلے

لگن باطل کی ھے تجھکو، تو علم حق کو بھولا ھے
فقط روٹی کی خاطر نقد دیں کو تو نے بیچا ھے

تو سرگردان و آوارہ ھؤا ھے دھن میں سرسے کی
نہاں ھے تیری نظروں سے مگر چشم سیہ تیری

---

* حضرت ابراھیم نے ایک چمکتے ستارے کو آسمان پر دیکھ کر گمان کیا کہ وہ خدا ھے لیکن جب وہ غروب ھو گیا تو آپ نے فرمایا: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۔ یعنی مجھے غائب ھو جانے والے پسند نہیں ۔ چاند اور سورج کو طلوع ھوتے دیکھ کر بھی ایسے ھی خیالات اُن کے دل میں پیدا ھوئے لیکن اُن کے غروب کے ساتھ ھی ھدایت الہی کی روشنی نصیب ھوئی ۔ (قرآن حکیم ۔ پارہ ۷ ۔ سورۃ الانعام)

تمنا کر کہ تجھکو آب حیواں دے دم خنجر
تو خواھاں ھو کہ تجھکو سانپ کے منہ سے ملے کوثر

طلب کر سنگ اسود تو در بتخانہ سے جا کے
طلب کر مشک کا نافہ سگ دیوانہ سے جا کے

نہ لیکن ڈھونڈ سوز عشق ھرگز علم حاضر سے
ملیگا کیف حق کا جام کیا اس پختہ کافر سے

مجھے آوارہ رکھا ایک مدت علم کی لو نے
بنایا محرم راز اپنا مجھکو دانش نو نے

چمن والوں نے میرا امتحاں کر کے مجھے پرکھا
کیا ھمراز مجھکو تب آنہوں نے اس گلستاں کا

نہیں گلشن، حقیقت میں یہ لالہ زار عبرت ھے
گل کاغذ کی صورت یہ سراب رنگ و نکہت ھے

ھؤا ھوں قید سے اس گلستاں کی میں رھا جب سے
بنا ھے آشیانہ شاخ طوبیٰ پر مرا تب سے

نظر کے واسطے ھے علم نو سب سے بڑا پردہ
ھے اسکا بت پرستی ، بت فروشی ، بت گری ، شیوہ

پڑی ہے پاؤں میں اسکے مظاہر کی کڑی بیڑی
حدود حس سے یہ نکلے، نہیں تدبیر کچھ اسکی

گرا یوں راہ ہستی میں، اسے جینا ہؤا دو بھر
خود اپنے ہی گلے پر اس نے آخر رکھدیا خنجر

نہیں ہے اسکی آتش میں حرارت لالہ کی صورت
بظاہر شعلہ رکھتا ہے، خنک ہے ژالہ کی صورت

رہی آزاد فطرت اسکی سوز عشق سے یکسر
جہاں جستجو میں ہے یہ ناکامی کا نوحہ گر

خرد کے عارضوں کا عشق افلاطون ہوتا ہے
اُترتا ہے جنوں اسکا، یہ جب نشتر چبھوتا ہے

وہیں سجدے کرے عالم جہاں پر عشق فرمائے
یہ وہ محمود ہے جو سومنات عقل کو ڈھائے*

رہی خالی صراحی علم نو کی عشق کی مے سے
نہ راتیں آشنا اسکی ہوئیں فریاد کی لے سے

---

* متبادل ترجمہ بھی ہؤا تھا :—
جہاں کے ساکنوں کا عشق ہی مسجود ہے گویا
خرد ہے سومنات اور اُسکا یہ محمود ہے گویا

رھی کم تیری نظروں میں ترے شمشاد کی قیمت
عطا کی دوسروں کے سرو کو تو نے مگر رفعت

مثال نے خود اپنے آپ کو تونے کیا خالی
بنا یا تونے دل اپنا نوائے غیر کا حالی

تو خوان غیر سے ھے ایک ریزہ مانگتا پھرتا
تو غیروں کی دکاں سے جنس اپنی کا ھؤا جویا

جل آٹھی بزم مسلم کی چراغ غیر سے آخر
لگی آگ اسکی مسجد کو شرار دیر سے آخر

حرم کی سر زمیں سے جب نکل کر آ گیا آھو
ھؤا صیاد کے تیروں سے چھلنی آسکا پھر پہلو

پریشاں مثل بو ھیں پتیاں گل کی، چمن اجڑا
خودی سے بھاگنے والے پھر اپنی سمت واپس آ

امانت دی گئی تجھکو کتاب پاک کی حکمت
کہیں سے ڈھونڈ لا اپنی وھی کھوئی ھوئی وحدت

حصار عافیت ملت ھے، ھم ملت کے ھیں دربان
ھوئے ترک شعار قوم سے ھم تارک ایماں

ہؤا ہے ٹکڑے ٹکڑے ساقئی دیرینہ کا ساغر
پریشاں بزم رندان حجازی ہوگئی یکسر

بتوں سے کعبہ کو آباد رکھنا کام ہے اپنا
ہنسی جسکی اڑائے کفر وہ اسلام ہے اپنا

محبت میں بتوں کی شیخ نے اسلام ہارا ہے
جو سلک سجہ لازم ہو، اسے زنار پیارا ہے

سفیدی نے سروں کی ہے بنایا پیر پیروں کو
ملا موقعہ ہنسی کا ہر گلی کوچہ کے بچوں کو

ہوئے ہیں لا الہ کے نقش سے دل اُن کے بیگانے
ہوس کی مورتوں سے ہوگئے آباد بتخانے

ہؤا ہر مو دراز اب طاق طرز خرقہ پوشی میں
کیا ہے نام ان سوداگروں نے دیں فروشی میں

سفر میں رات دن رہتے ہیں ساتھ اپنے مریدوں کے
وہ ہیں نا آشنا ملت کی ہر ادنیٰ ضرورت سے

نہیں ہے نور کوئی مثل نرگس اُن کی آنکھوں میں
دل زندہ کی دولت کی کمی ہے اُن کے سینوں میں

مگن منصب پرستی میں ہوئے سب واعظ و صوفی
نہیں ہے اعتبار اب ملت بیضا کا کچھ باقی

لگی ہے آنکھ واعظ کی صنم خانے کے منظر پر
بنا ہے مفتئ دین مبیں فتووں کا سوداگر

کیا ہے رخ ہمارے پیر نے میخانے کا سیدھا
بتاؤ ہمدمو تم ہی کہ ہو تدبیر اپنی کیا

وقت تلوار ہے *

رہے سبزہ ہمیشہ شافعی کی پاک تربت پر
ہوئی ہے تاک جسکی ایک عالم کو نشاط آور†

اڑایا فکر نے اسکے سر گردوں سے اک تارا
کہا اس نے کہ ہے شمشیر براں وقت کا دھارا

---

* اَلْوَقْتُ سَیْفٌ قَاطِعٌ ۔ حضرت امام شافعی کا مقولہ ہے ۔

† تاک ۔ انگور کی بیل ۔

بیاں مشکل ھے اِس تلوار کے سر نہانی کا
چھپا ھے آب میں اسکی، اثاثہ زندگانی کا

امید و بیم سے ھوتا ھے مالک اسکا بالا تر
ھے روشن ھاتھ آسکا دست موسیٰ سے کہیں بڑھکر

رواں چشمہ ھو پتھر سے فقط اک ضرب سے آسکی
سمندر سے آڑے پانی، وہ پل بھر میں بنے خشکی

اسی شمشیر کو قابو میں لائے حضرت موسیٰ
رھا ھے کام آن کا اسلئے تدبیر سے بالا

اسی سے کر دیا دریا کا سینہ چاک موسیٰ نے
بنایا خشک قلزم کو مثال خاک موسیٰ نے

جہاں میں پنجۂ حیدر جو خیبر گیر کہلایا
اسی شمشیر کی قوت نے آس پنجے کو گرمایا

تقاضائے نظر کرتی ھے گردش چرخ گرداں کی
ھمارے فکر کو دعوت ھے روز و شب کی تبدیلی

تو روز و شب کے چکر سے نکل، وا چشم بینا کر
ترے دل میں ھے اک عالم نہاں، آسکا تماشا کر

زمین دل میں تو نے بیج تاریکی کا بویا ہے
مثال خط جو تو نے وقت کے دھارے کو سمجھا ہے

تجھے طول زمانہ ناپنے کا جب خیال آیا
تو رات اور دن میں تیرے فکر نے مشکل کا حل پایا

پہن لی تو نے رسی وقت کی، زنار کی صورت
تری مثل بتاں باطل فروشی بن گئی عادت

حقیقت میں تو تھا اکسیر، لیکن اب ہے مشت گل
تجھے خالق نے سر حق کیا، تو ہوگیا باطل

جو مسلم ہے تو اس زنار کے پھندے سے باہر آ
تو بن کر ملت احرار کی شمع منور آ

نہیں اے بے خبر اصل زماں سے آگہی تجھکو
ہو کیسے پھر حیات جاوداں سے آگہی تجھکو

اسیر روز و شب کب تک رہیگا اے جہاں دیدہ؟
حدیث 'لی مع اللہ' میں ہے رمز وقت پوشیدہ*

نمود این و آں ہے وقت کی رفتار پر مبنی
حیات اک راز ہے جسکی ہے دست وقت میں کنجی

---

* لی مَعَ اللہ وقت''۔ (حدیث مشہور)۔ مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت وقت مکانی سے اپنے اپ کو بالا تر محسوس کرتے تھے۔

حقیقت وقت کی، خورشید کی گردش سے بالا ہے
کہ ہے خورشید فانی، وقت دائم رہنے والا ہے

ہم ہیں وقت میں سب عیش و غم، شادی بھی ماتم بھی
یہ ہے وہ راز جس سے روشنی ہے چاند سورج کی

زماں کو بے خبر مثل مکاں پھیلا دیا تو نے
تمیز دوش و فردا اپنا شیوہ کر لیا تونے

گلستاں چھوڑ کر اپنا تو مثل بو ہے سرگرداں
بنایا تو نے اپنے ہاتھ سے اپنے لئے زنداں

نہیں ہے اول و آخر ہمارے وقت کا کوئی
خیابان ضمیر آدمی سے ہے نمود اسکی

جو اسکی اصل پا جائے تو پھر زندہ ہو زندہ تر
درخشاں اسکی ہستی ہو سحر کے نور سے بڑھکر

ہے ہستی دھر سے اور دھر کا ہستی سے امکاں ہے
'نہ دو تم دھر کو دشنام'، پیغمبر کا فرماں ہے*

---

* لَاتَسُبُّوالدَّهْرَ (حدیث) - "زمانے کو برا بھلا مت کہو"۔

ھے مثل گوھر رخشاں یہ نکتہ جو سجھاتا ھوں
میں عبد و حر میں تجھکو فرق کرنا اب سکھاتا ھوں

طلسم روز و شب میں عبد گم ھو کر ھے رھجاتا
دل حر میں زمانہ خود مگر کھو کر ھے رھجاتا

دنوں کے تار لیکر عبد بنتا ھے کفن اپنا
وہ روز و شب کے جالے سے چھپا لیتا ھے تن اپنا

جکڑ کر پائے حر رکھے، یہ مٹی میں کہاں دم ھے
زمانے پر وہ چھا جاتا ھے، وسعت کا یہ عالم ھے

پھنسا ھے عبد یوں شام و سحر کے دام میں آکر
ھوئی پرواز کی لذت حرام اسکے دل و جاں پر

مگر آزاد کے سینے میں سانسوں کی وہ تیزی ھے
وھاں پر طائر ایام خود مجبور قیدی ھے

نہیں تحصیل حاصل کے سوا کچھ عبد کو فطرت
نہیں ھوتی ھے اسکی واردات جاں میں کچھ ندرت

وہ کاھل ھے بدلتا ھی نہیں ھرگز مقام اسکا
فضا میں گونجتا رھتا ھے نالہ صبح و شام اسکا

نئی تخلیق ہر دم کرتے رہنا، حر کا حصہ ہے
برستا اسکے تاروں سے ہمیشہ تازہ نغمہ ہے

اٹھائے اسکی فطرت کس طرح تکرار کی زحمت
نہیں ہے اسکا جادہ حلقۂ پرکار کی صورت

زمانہ عبد کے دل کو کڑی زنجیر ہوتا ہے
ہمیشہ اسکے لب پر شکوۂ تقدیر ہوتا ہے

اشارہ حر کی ہمت کا قضا کا رخ بدلتا ہے
جو ہونا ہے وہ اسکے ہاتھ کے سانچے میں ڈھلتا ہے

جو گذرا ہے، جو آئیگا، ہیں سب 'موجود' میں اسکے
ہوئی ہر 'دیر' ہے آرام فرما 'زود' میں اسکے

یہ بات ایسی ہے بے آواز جو سننے میں آ جائے
نہیں ممکن کہ ایسی بات کو ادراک پا جائے

بیاں میرا بیاں ہو کر ہؤا معنی سے شرمندہ
نہیں لفظوں سے کچھ مطلب، مجھے معنی سے ہے شکوہ

جونہی لفظوں میں آیا زندہ معنی، اسکو موت آئی
تری سانسوں سے اسکی آگ پر افسردگی چھائی

حضور و غیب کا نکتہ ہمارے دل کے اندر ہے
روانی وقت کی اور رمز ایام اس میں مضمر ہے

سماعت میں نہیں آتے ہیں ساز وقت کے نغمے
تو راز وقت سمجھیگا اُتر کر قلب میں اپنے

کبھی وہ دن تھے اپنے دست و بازو میں بھی طاقت تھی
ہمارے ہاتھ اور سیف زمانہ میں رفاقت تھی

دلوں کی کھیتیوں میں دیں کا پودا ہم لگاتے تھے
تھے ہم، رخسار حق سے جو کبھی پردے ہٹاتے تھے

وہ تھا ناخن ہمارا جس نے دنیا کی گرہ کھولی
ہمارے سجدوں سے اس خاکداں کی پر ہوئی جھولی

خم حق سے شراب ارغوانی ہم لنڈھاتے تھے
پرانے میکدوں کو، مار کر شبخوں، مٹاتے تھے

سن اے جو بادۂ دیرینہ سے پر ہے ترا مینا
ہو شیشہ آب جس سے، وہ ہے تیری گرمئی صہبا

غرور و ناز ہے تجھکو بہت اپنی بڑائی پر
ہے طعنہ زن تو مدت سے ہماری بے نوائی پر

کبھی وہ دن بھی تھے جب جام اپنا زیب محفل تھا
کبھی سینے میں اپنے ایک جیتا جاگتا دل تھا

یہ عصر نو، کیا ہے جسکے جلووں نے تجھے شیدا
ہمارے کاروان کی گرد منزل سے ہؤا پیدا*

کیا سیراب کشت حق کو ہم نے خون سے اپنے
جہاں کے سب پرستاران حق ممنون تھے اپنے

ہمارے دم سے گونجی ہر طرف تکبیر عالم میں
ہماری خاک سے کعبے ہوئے تعمیر عالم میں

خدا نے حرف 'اقرأ' کی ہمیں تعلیم فرمائی
ہمارے ہاتھ سے ہی اس نے روزی سب کو پہنچائی†

جو تخت و تاج تھے اپنے، ملے ہیں گرچہ اوروں کو
حقارت کی نظر سے دیکھ مت ہم بے نواؤں کو

---

* تحقیق سے ثابت ہے کہ علوم جدیدہ کا فروغ یورپ میں بہت حد تک عربوں کی علم دوستی کا مرہون منت ہے۔

† اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ (قرآن حکیم۔پارہ ۳۰۔سورۃ العلق)
"پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا"۔ اولین وحی الہیٰ کے مقدس الفاظ جو رسول کریم پر نازل ہوئی۔

تری نظروں میں ہم نقصان اپنا آپ کرتے ہیں
مگن کہنہ خیالوں میں ہیں، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

ملی ہم کو جہاں میں لا الہ سے آبرو ساری
ہمیں بخشی گئی ہے ہر دو عالم کی نگہداری

ہمیں امروز کا غم ہے نہ کوئی فکر فردا ہے
کسی سے عہد الفت ہم نے مضبوطی سے باندھا ہے

ہم ایسا راز ہیں جو قلب یزداں میں ہے پوشیدہ
ملا ہارون و موسیٰ کا ہمیں دنیا میں ہے ورثہ

تجلی ہے ہماری چاند سورج میں عیاں ابتک
ہمارے ابر میں ہیں بجلیوں کے آشیاں ابتک

خدا کی ذات کا آئینہ، اپنی ذات فانی ہے
جہاں میں ہستئی مسلم، خدا کی اک نشانی ہے

دُعا

تو اے جو عالم امکاں کے تن میں صورت جاں ہے
ہماری جان جاں ہو کر بھی تو ہم سے گریزاں ہے

کرم تیرے سے نغمے، زندگی کے ساز نے پائے
حیات اُس موت پر قرباں جو تیری راہ میں آئے

دل ناشاد کی تسکین بن پھر ایکبار آ کر
ہمارے سینوں کو آباد کر پھر جلوہ فرما کر

طلب کر ہم سے ننگ و نام پھر اکبار اے آقا
بنا دے عشق میں پھر ہم کو پختہ کار اے آقا

مقدر سے ہمیں شکوہ ہے اپنی نارسائی کا
گراں بازار ہے تیرا، گلہ ہے بے نوائی کا

ہیں خالی ہاتھ گو سائل، رخ زیبا نہ پنہاں کر
خدایا عشق سلماں و بلال اب عام و ارزاں کر

عطا کر دل کو بے تابی، دے پھر دیدہ کو بے خوابی
تری بخشش ہے بے پایاں، ہمیں فطرت دے سیمابی

کوئی واضح نشانی اے خدا دنیا میں ظاہر کر
کہ ہو جائیں نگوں جس سے ہمارے دشمنوں کے سر*

نظر تیری سے کوہ آتشیں یہ کاہ بنجائے
اور اسکے سامنے خاشاک 'غیر اللہ' بنجائے

بکھر کر قوم نے وحدت کا رشتہ کھو دیا جب سے
پڑی ہیں الجھنیں سو سو ہمارے کام میں تب سے

جہاں میں ہم ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے سے ہیں
شناسا ہیں مگر نا آشنا اک دوسرے سے ہیں

یہ اوراق پریشاں ہیں انہیں پھر سے بہم کر دے
عطا پھر ہم کو آئین محبت کا علم کر دے

ہمیں پھر خدمت سابق ملے در سے ترے مولیٰ
پھر اپنا کام اپنے عاشقوں کو سونپ دے سارا

مسافر ہیں، ہمیں تسلیم کی منزل عطا کر دے
دلوں کو قوت ایمان ابراہیم سے بھر دے

---

* اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ

(پارہ ۱۹ - سورۃ الشعراء) - اگر ہم چاہیں تو اُن پر آسمان سے نشانی اتار دیں - پھر ان کی گردنیں اسکے آگے جھک جائیں -

عطا کر عشق نکتہ رس کو رمز 'لا' سے آگاہی
کہ وہ پھر 'لا' سے 'الا اللہ' کی منزل کا ہو راہی

مثال شمع اوروں کیلئے تن من جلاتا ہوں
میں خود روتا ہوں، اپنی بزم کو رونا سکھاتا ہوں

مرے مولیٰ! عنایت ہو مجھے اک دلفروز آنسو
ہو ایسا بیقرار و مضطر و آرام سوز آنسو

کہ اسکو باغ میں بوؤں تو پھوٹیں آگ کے جھالے
قبائے لالہ سے جو آتشیں دھبا مٹا ڈالے

مرا دل محو ماضی ہے، مگر رخ سوئے فردا ہے
میں وہ ہوں جو بھری محفل کے اندر رہ کے تنہا ہے

گماں ہر اک کو ہے، حاصل ہے اسکو دوستی میری
نہ کی کچھ جستجو اس نے مرے سینے کے رازوں کی

الٰہی تیری دنیا میں نہیں کوئی ندیم اپنا
ترستا ہے مرا سینا، کوئی آئے کلیم اپنا

میں ظالم ہوں، ستم ڈھائے ہیں اپنے آپ پر میں نے
بنایا اپنے پہلو میں ہے اک شعلے کا گھر میں نے

وہ شعلہ جو کرے سامان عقل ہوش کو غارت
لگا کر آگ دامان خرد کی پھونک دے دولت

سکھا دی عقل کو دیوانگی کی ہرا دا جس نے
جلا یا علم کا سامان ہستی برملا جس نے

فلک پر جس کے سوز دم سے ہے خورشید کا پرچم
وہ، جس کے گرد چکر کاٹتی ہیں بجلیاں پیہم

میں تنہا شب کو شبنم کی طرح رویا کیا اکثر
ملی مجھکو امانت آتش پنہاں کی تب جا کر

سکھایا میں نے شمع بزم کو ہے برملا جلنا
رہا پنہاں مگر دنیا کی نظروں سے مرا جلنا

لپک کر ہر بن مو سے مرے شعلے نکل آئے
شرارے میرے فکر گرم کی رگ رگ نے برسائے

مرے بلبل نے پھر چنگاریوں کے چن لئے دانے
بلند آسنے کئے اک آتشیں نغمے کے یوں شعلے

زمانہ میں نے وہ پایا ہے جو محروم ہے دل سے
تڑپتا ہے دل مجنوں، گئی لیلیٰ جو محمل سے

بہت مشکل ہے شمع زار تنہا ہی رہے سوزاں
نہیں افسوس اک پروانہ میری بزم کے شایاں

رہوں میں منتظر کب تک کہ کوئی غمگسار آئے
کروں یہ جستجو کب تک کہ کوئی رازدار آئے

مہ و خورشید کو کرنوں کی دولت بخشنے والے
مری جان حزیں سے اپنی چنگاری کو لوٹا لے

سنبھال اپنی امانت، میرا سینہ بھی سکوں پائے
مرے آئینہ سے اب خار جوہر کا نکل جائے

و گرنہ مجھکو بھی اک ہمدم دیرینہ دے یا رب
جو عالم سوز ہے اس عشق کو آئینہ دے یا رب

سمندر کی فضا میں موج سے ہے موج ہم پہلو
تڑپنا ہمدموں کے ساتھ لہروں کی ہے کہنہ خو

ستارے کی ستارے سے رفاقت آسماں پر ہے
مہ تاباں کو تسکیں شب کے پہلو میں میسر ہے

بندھا ہے دن کا دامن رات کے تاریک آنچل سے
بڑا مضبوط رشتہ ہے جہاں میں آج کا کل سے

هر اک دریا کسی دریا میں اپنا آپ کھوتا ہے
هر اک جھونکا ھوا کا گم کسی خوشبو میں ھوتا ہے

صدائے رقص سے آباد ہے ھر ایک ویرانہ
رفیق رقص ہے ھر ایک دیوانے کا دیوانہ

اگرچہ ذات میں اپنی تو لاثانی ہے یکتا ہے
مگر اپنے لئے تو نے بھی اک عالم بنایا ہے

جہاں میں زندگی میری ہے مثل لالۂ صحرا
مجھے محسوس ھوتا ہے کہ محفل میں بھی ھوں تنہا

تمنا ہے کہ تیرے لطف سے ھمدم ملے مجھکو
مری فطرت کی رمزوں کا کوئی محرم ملے مجھکو

وہ ھمدم جو ھو دیوانہ، وہ ھمدم جو ھو فرزانہ
جسے پروا نہ ھو کوئی، جو دنیا سے ھو بیگانہ

میں اپنا نعرۂ مستانہ اسکی روح میں بھر دوں
پھر اسکے دل کے آئینے میں اپنا عکس میں دیکھوں

میں اسکے جسم کا پتلا بناؤں خاک سے اپنی
صنم بھی اسکا ھو جاؤں، بنوں میں اسکا بتگر بھی